معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ / روپے فی شمارہ ۱۲ / روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ / روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس (۲۵) پونڈ یا چالیس (۴۰) ڈالر

بحری ڈاک نو (۹) پونڈ یا چودہ (۱۴) ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۰ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۰۲ء عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

قرآن مجید سب سے آخری مگر دنیا کی سب سے مقدس و برتر کتاب ہے جو نوع انسانی کی اصلاح و ہدایت اور زمین سے شر و فساد ختم کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے، اس کا مقصد امن و امان اور حق و انصاف قائم کرنا اور ظلم و ناانصافی اور جہل و باطل کو مٹانا ہے، یہ مریضان کفر و شرک کے لئے نسخۂ شفا اور ان کے دلوں کا علاج ہے، لوگوں کے شکوک و اوہام کو دور کرنا، انہیں ضلالت و غوایت سے نکالنا اور علم و یقین کی روشنی اور حکمت و بصیرت عطا کرنا اس کا کام ہے، یہ دنیا کے سب سے افضل اور بہتر شخص محمد عربی علیہ الف الف تحیۃ کے ذریعہ جو خدا کے آخری نبی و رسول تھے، اس لئے اتارا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ جو لوگوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے، انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے جس نبی کی عظمت و صداقت و دیانت کا اعتراف اس کے زمانے کے اس کے شدید ترین مخالفوں کو بھی تھا، وہ نبوت و رسالت ملنے سے پہلے ہی اپنی قوم میں امین کے لقب سے ممتاز تھا اور آج بھی اس کی راست بازی کا اعتراف کیا جارہا ہے، خود قرآن مجید نے نبی کو بے عیب، کذب و افترا اور ضلالت و غوایت سے پاک بتایا ہے اور کہا ہے کہ جو کلام اس کی زبان سے ادا ہو رہا ہے وہ شاعر و کاہن اور خبطی و مجنون کا کلام نہیں ہے، اسے نبی نے نہ خود گڑھا ہے اور نہ اس میں کذب و باطل کی کہیں سے آمیزش ہوئی ہے، اللہ نے جس فرشتے کو نبی کے پاس اپنا کلام لانے کے لئے منتخب کیا وہ بھی سارے ملائکہ میں امین تھا۔

خدا نے خود قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، اس میں ملاوٹ اور آمیزش یا تحریف و تبدیل کے سارے امکانات اس نے بند کردیئے ہیں، نبی اکرم ﷺ غلطی یا کمی بیشی اور تغیر و تبدل کے اندیشے سے اسے پڑھنے اور یاد کرنے کے لئے اگر جلدی کرتے تو آپؐ کو اللہ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی کہ اسے پڑھانا اور یاد کرانا ہمارے ذمہ ہے، چنانچہ دنیا میں مسلمان جہاں اور جس جگہ آباد ہیں، کوئی جگہ حفاظ سے خالی نہیں، ایک ایک ملک میں لاکھوں بلکہ اس سے بھی سوا ایسے لوگ ہیں جن کے سینوں میں قرآن کریم محفوظ ہے، اگر کوئی بد بخت اور ظالم حکمراں (نعوذ باللہ) قرآن مجید کے سارے نسخے بھی جلا اور پھاڑ ڈالے تو یہ حفاظ اپنی یادداشت سے دوسرا بالکل صحیح اور نیا نسخہ تیار کردیں گے اور اس میں ایک لفظ، ایک حرف اور ایک شوشہ کا بھی فرق نہ ہوگا، قرآن مجید اپنے بارے میں بڑے وثوق سے اعلان کرتا ہے کہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (یہ کتاب ہے جس میں کچھ شک نہیں) وہ کھلم کھلا چیلنج کرتا ہے کہ اگر کسی کو اس کے منزل من اللہ ہونے میں شبہہ ہو تو وہ اس جیسی کوئی سورہ یا کوئی آیت ہی لادے، وہ بہ بانگ دہل یہ اعلان عام بھی کرتا ہے کہ "اگر سارے انس و جن مجتمع ہو کر بھی اس قرآن جیسا

بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے گو وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں" یہ تحدی ان عربوں کو کی گئی تھی جن کی زبان آوری مسلم تھی، جن کو اپنی فصاحت و بلاغت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ اپنے علاوہ ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے مگر وہ اپنی کمال طلاقت لسانی اور اسلام اور قرآن کی دشمنی کے بھی ایسا کرنے سے عاجز و درماندہ رہے۔

صحت و صداقت کے اعتبار سے دنیا کی کوئی کتاب قرآن مجید کا مقابلہ نہیں کرسکتی، یہود و نصاریٰ کا صحف سماوی کا حامل ہونا تسلیم شدہ ہے، لیکن اب ان کے پاس بھی خدا کی بھیجی ہوئی اصل کتاب نہیں ہے، تورات کی بار بار گم شدگی اور از سر نو مرتب کیا جانا ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے، حضرت عزیرؑ اور یہودیوں کے ربیوں اور احبار کے مرتب کردہ نسخے بھی ضائع ہوتے رہے ہیں، یہود جس عبرانی نسخے کی پیروی کرتے تھے، اس کو دوسری صدی عیسوی میں جمع کیا گیا تھا، اس کی نسبت انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "اس میں چند تحریفیں تو ایسی ہیں جو اب صاف نظر آتی ہیں اور غالباً ایک کافی تعداد تک ایسی تحریفیں اور بھی موجود ہیں جن کی شاید اب یا کبھی پورے طور سے قلعی نہ کھل سکے" اناجیل اولاً تو بے شمار ہیں ثانیاً یہ سب حضرت مسیحؑ کے بعد ان کے حواریوں اور دوسروں سے منسوب ہیں، ان میں خاص شہرت متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلوں کو ملی، ان کے اور اعمال حواریین، پال کے ۱۳ خطوط، پیٹر، جان اور جود کے نامہ جات اور مکاشفات یوحنا کے علاوہ جن کا نام "عہد نامہ جدید" ہے ساری انجیلوں اور نامہ جات کو نیقیہ کی مشہور کونسل کے بعد سے جعلی قرار دیا جا چکا ہے، گو اٹھارہویں صدی عیسوی تک نصاریٰ عہد جدید کی کتابوں کو کلام الٰہی سمجھتے تھے لیکن اب نئی تحقیقات نے مروجہ انجیلوں کو بھی الحاقی، حضرت عیسیٰؑ کے رفع آسمانی کے بعد کی تصنیفات اور حواریین کی جانب ان کی نسبت کو مشکوک قرار دیا ہے، اناجیل ہی نہیں پال نے تو مسیحی مذہب ہی کو بالکل نئی شکل دے دی تھی، صحف سماوی کی اس حالت کے بعد ان کتابوں کو جو اپنے ماننے والوں کے دست تصرف یا امتداد زمانہ سے کتھائیں، کہانیاں اور دیومالائی قصے ہوچکی ہیں، قرآن برتر کے مقابلے میں لانا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے ع

فلک بیں چہ ظلم آشکارا کند   کہ اسکندر آہنگ دارا کند

قرآن مجید کسی ایک گروہ اور قوم یا کسی خاص ملک ہی کے لئے نازل نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی دعوت اور پیغام عالم گیر ہے، وہ عرب و عجم، ایشیا، یورپ اور امریکہ غرض شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک سب کے لئے ہے، یہ کوئی نئی دعوت بھی نہیں ہے، گزشتہ صحف سماوی میں بھی اسی کی تعلیم دی گئی ہے، قرآن نہ جنگ و جدال اور نفرت و تشدد کی تلقین کرتا ہے اور نہ فرقہ وارانہ اور علاقائی اور نسلی و وطنی جذبات بھڑکا کر ہیجان، فساد، انتشار اور خلفشار برپا کرتا ہے، اس کی تعلیم و ہدایت سے دنیا میں انقلاب آیا اور

پرامن نظام قائم ہوا، وہ چودہ سو برس پہلے نازل ہوا تھا، آج ہی کیوں اس سے نقضِ امن کا اندیشہ اور خطرہ پیدا ہوگیا ہے، اس کو امن عامہ میں خلل انداز اور ملک کو درہم برہم کردینے والا کہنے والے خود اپنے دلوں کی کجی اور اپنی طبیعتوں کے فساد کی اصلاح کریں، قرآن کسی کو زور و زبردستی سے اپنا پیغام ماننے کے لئے مجبور نہیں کرتا، اس کے اندر دلوں میں اثر و نفوذ پیدا کرلینے کی بڑی صلاحیت ہے، لوگ اس کی صداقت کی بنا پر خود بخود اس کے حلقہ بگوش اور اسے تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں، اس کی دل آویزی اور کشش ہی کی بنا پر اس کے مخالفین لوگوں کو اسے سننے سے روکتے تھے اور جب وہ پڑھا جاتا تھا تو اتنا غل مچاتے تھے کہ اس کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑے، وہ اول روز سے ہی نبی سے اس کا مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ "اس کے سوا دوسرا قرآن لاؤ یا اسی کو بدل دو" (تاکہ ہم بھی اس پر ایمان لائیں) نبی سے اس کا جواب دلایا جاتا "میری مجال نہیں کہ میں اپنے جی سے اس کو بدل دوں، میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے"۔

قرآن مجید کوئی قصہ کہانی کی کتاب یا افسانہ اور اساطیری داستان نہیں ہے کہ جب جی چاہا اس میں اپنی مرضی سے گھٹا بڑھا اور حذف و اضافہ کرلیا یا سرکشی اور عناد سے اس میں رد و بدل اور کمی و بیشی کرلی، اگر قرآن کے ماننے والوں سے اس میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو یہ نہایت شر انگیز اور زہرناک ہے مگر وہ اس سے بالکل مشتعل نہ ہوں اور اسے خبطی و مجنون کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کردیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ اگر ہمارے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند بھی رکھ دو تو بھی ہم قرآن میں ترمیم و تنسیخ کی جسارت نہیں کرسکتے بلکہ خواب میں بھی اس کا خیال اپنے دل میں نہیں لاسکتے، قرآن تو ساری دنیا کے لئے نعمت ہے، ہم اس کی دعوت و اشاعت پر مامور کئے گئے ہیں، اس لئے خدا کی اس نعمت کو اس کے بندوں تک پہنچانا ہمارا فریضہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس فریضہ سے غافل اور تارکِ قرآن ہوکر ذلیل و خوار ہوجانے کی بنا پر ہی اشرار، مفسدین اور فتنہ پردازوں کو اس قسم کا مطالبہ کرنے کی جرأت و ہمت ہورہی ہے جن کا کام ہی مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرکے انہیں طیش دلانا اور ان کو اس طرح کی لغو باتوں میں الجھا کر انہیں اپنے اصل مقاصد سے منحرف اور تعمیر و ترقی کے مسائل سے بے پروا کردینا ہے، کیونکہ اب قیادت و سیادت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں سے چھوٹتی اور زمین ان کے پیروں سے نکلتی جارہی ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا اس لئے وہ اس طرح کی ہذیانی باتیں کررہے ہیں ع

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔

مقالات

علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت ☆

از: ضیاء الدین اصلاحی

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مغرب کی سیاسی و تہذیبی بالادستی سے پوری دنیائے اسلام تہہ و بالا ہورہی تھی۔ مسلمانوں کی حکومتیں ختم یا نیم جاں ہوتی جارہی تھیں، حکومت چھن جانے کے بعد ان کا اپنے دین و ایمان، عقیدہ و مذہب اور تہذیب و روایات سے بھی تعلق کمزور ہونے لگا تھا اور مغرب کے علوم و فنون اور نظر فریب تمدن کی چمک دمک کے سامنے انھیں اپنے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن بے آب و تاب اور پھیکے دکھائی دے رہے تھے اور وہ یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ اس کی ذہنی غلامی میں بھی گرفتار ہوتے جارہے تھے۔

کم و بیش یہی حال ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی تھا ان کے سروں پر ادبار و فلاکت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ہر سمت سے ان پر یلغار ہورہی تھی، ۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے، ملک میں بچھی ہوئی انگریزوں کی سیاسی بساط کو الٹ دینے کے لئے اس سال مرحوم بہادر شاہ ظفر کے پرچم تلے جمع ہوکر ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو منظم بغاوت کی تھی وہ ناکام ہوگئی اور مغلیہ سلطنت کا آفتاب ہندوستان کے افق سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگیا اور انگریز پورے ملک پر قابض ہوگئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد انگریزوں کا جذبہ انتقام اور بھڑک اٹھا اور ملک کے باشندوں پر ان کا جبر و تشدد بہت بڑھ گیا، انھوں نے اقتدار مسلمانوں سے

☆ یہ مقالہ ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۲۲؍ جون ۲۰۰۲ کو پڑھا گیا تھا۔ اب مولانا کے وفات کے مہینے کی مناسبت سے اسے قارئین معارف کی نذر کیا جاتا ہے۔

چھینا تھا اس لئے انھیں زیادہ خطرناک سمجھ کر خاص طور پر اپنے عتاب اور وحشت و بربریت کا نشانہ بنایا، بے شمار معصوم اور بے گناہ لوگوں کو تختۂ دار پر لٹکا کر پھانسیاں دے دی گئیں، ہزاروں کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ صرف جان و مال کے اتلاف ہی پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ ان کے وجود اور تشخص کو ختم کرنے اور ان کی دینی، ملی، تہذیبی اور اخلاقی روایات بھی مٹا دینے کے درپے ہو گئے اس دور کے ایک عینی مشاہد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (المتوفی ۱۸۸۰ء) تحریر فرماتے ہیں۔

"اور (۱) یہ وہ معرکہ تھا جس میں ملکِ ہندوستان میں شوکتِ اسلام بالکل زائل ہوگئی تھی اور کارخانہ اسلام کا تہ و بالا ہوگیا تھا، مسلمان ہونا ہی جرم ہوگیا تھا۔ اکابرِ دین کا خاتمہ ہوگیا تھا، ہر مسلمان سراسیمہ حال تھا۔ ہر مومن شکستہ بال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی کہ نہ میں تجھ نہ تو مجھ' کا حال تھا یا نفسی نفسی کا مقال تھا، جتنا جو بڑا تھا۔ اتنا ہی بڑا اس پر صدمہ تھا، اکثر اکابرِ دین جنت الفردوس کو سدھارے اور بعض بعض جو بچے کھچے اجل سے بچے، اس ملک سے ہجرت فرما گئے۔ ہندوستان میں اسلام پر قریب قریب اسی کے صدمۂ عظیم واقع ہوا تھا جیسے حضرت رسول مقبول ﷺ کی وفات شریف پر کل اسلام پر، مسلمانوں کی قلت، کفار کی کثرت، کفر کی شدت، بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین نسیاً منسیاً ہو جائے گا" (۲)۔

انگریز اپنا اقتدار ہی مضبوط و مستحکم نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اپنے مذہب، تمدن اور تہذیب کا بول بالا کر کے مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی نقوش کو مٹا دینا اور انھیں ایسا پسپا اور پامال کر دینا چاہتے تھا کہ وہ سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہ جائیں، اس کے لئے وہ مسلمانوں پر ہر طرف سے حملہ آور ہو رہے تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ (المتوفی ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں۔

"انگریزوں کے برسرِ عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے

(۱) یعنی ۱۸۵۷ء کا انقلاب (۲) مولانا مناظر احسن گیلانی: حیات قاسمی جلد دوم ص ۹۸ مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی ۱۳۷۵ھ

شروع کر دئے، دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق حکمرانوں سے نجات پا کر ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم و فنون و تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی" (۱)

مگر افسوس ہے کہ ایسے پر آشوب دور میں بھی عام مسلمانوں میں کوئی بے چینی اور تشویش نہیں تھی، انھیں نہ حالات کی شدت اور نزاکت کا کوئی احساس تھا اور نہ اپنی پسپائی اور زبوں حالی پر کوئی خلش اور اضطراب تھا، امراء اور خواص کا طبقہ عیش و عشرت میں منہمک اور خوابِ غفلت میں مدہوش تھا، علماء کی اکثریت بھی حالات سے بے پروا تھی، وہ بے روح مدرسی تعلیم، فقہی جزئیات کی رد و قدح اور فروعی مسائل میں بحث و مناظرے میں مشغول تھی، اس کو اس کا مطلق احساس نہیں تھا کہ انگریز ان کا وجود و تشخص، امتیاز و شناخت مٹا دینا اور اسلام کے اثر و نشان کو زائل کر دینا چاہتے ہیں۔

لیکن علماء میں ایک چھوٹا گروہ ایسا بھی تھا۔ جو ان حالات سے مضطرب اور پریشان تھا، اس کے دل میں قوم و ملت کا واقعی درد تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دین کی فہم و معرفت بخشی تھی اور وہ اس کی حکمت و مصلحت سے بھی واقف تھا، یہی گروہ عیسائی مبلغوں اور مشنریوں کی شر انگیزی اور فتنہ پردازی کے مقابلے کے لئے اٹھا، مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:۔

"خدا نے عیسائیوں کے مقابلے کے لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رحم علی صاحب منگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری (سابق ناظمِ ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کئے جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دئے اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو ردِ عیسائیت کے بارے میں تائید

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی: حیات شبلی (دیباچہ ص ۱۴-۱۵) طبع چہارم معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

غیبی سے کم نہیں اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلے کے
لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی
مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود ان ہی
کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا۔ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام
کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا''۔ (۱)

آریہ سماج اور ہندوؤں کی دوسری مذہبی و اصلاحی تحریکیں برہمو سماج وغیرہ بھی اسلام
کے قلعہ میں رخنہ اندازی کر رہی تھیں۔ ان کی سرکوبی بھی علماء کی اسی جماعت نے کی مولانا سید
سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

"آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلے کے لئے خاص طور سے مولانا محمد قاسم
صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور بھی تائید غیبی ہی کا نشان تھا''۔ (۲)

اس زمانے میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے عام مسلمان دین
سے منحرف اور برگشتہ ہونے لگے تھے، ان کے عقائد متزلزل ہو رہے تھے اور ان میں غیر مذہبی
رسوم و اعمال جڑ پکڑتے جا رہے تھے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ردِ عیسائیت و آریہ سماج کے
ساتھ ہی ارتداد کے سدباب کے لئے دینی تعلیم کو فروغ دینے کا کارنامہ بھی انجام دیا تاکہ
مسلمانوں میں خالص دینی روح باقی رہے۔ وہ صحیح عقیدہ و خیال پر قائم رہیں۔ اور ان میں
معاشرتی و اخلاقی خرابیاں نہ سرایت کریں، ان کے قائم کردہ شجرۂ طیبہ دارالعلوم دیوبند کے برگ
و بار آج بھی پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اسی کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم
صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے
ذریعہ انجام پایا اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔'' (۳)

(۱) دیباچہ حیات شبلی ص ۱۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً

اس طرح ان حضرات کی کوششیں بڑی کارگر ہوئیں اور انہوں نے عیسائی مشنریوں اور
مبلغوں اور آریوں کے فتنوں کی بیخ کنی بڑی کامیابی سے کی اور پوری قوت سے اسلام کی
مدافعت کر کے ان کے اعتراضات کے پرزے اڑا دئے مگر یہ اعتراضات علمی انداز کے بجائے
فرسودہ طرز کے تھے اس لئے ان پرانے طرز کے اعتراضات کے لئے وہی پرانا انداز، مناظرانہ
طرز یا الزامی جواب کافی تھا۔ جس کی تکنیک سے یہ علماء بہ خوبی واقف تھے، لیکن اس وقت اسلام
پر جو حملہ مستشرقین اور فضلائے مغرب کر رہے تھے اور جس طرح کے اعتراضات اور شکوک و
شبہات پیدا کر کے خود مسلمانوں کو مذہب اسلام سے متنفر کر رہے تھے، وہ زیادہ خطرناک اور ضرر
رساں تھے، ان کا جواب دینا آسان نہیں تھا، یہ اعتراضات علمی طرز کے سائنٹفک ہوتے تھے جن
کے مقابلے و مدافعت کی نئی تکنیک سے قدیم طریقہ سے تعلیم پائے ہوئے علماء واقف نہیں تھے،
مستشرقین عربی زبان کے ماہر اور اسلامی علوم کے فاضل تھے، یہ علم و تحقیق کی راہ سے سائنٹفک
انداز میں اسلام کی تصویر مسخ کر رہے تھے مسلمانوں کی جو کتابیں عرصے سے ناپید تھیں، انہیں
تلاش کر کے انہوں نے بڑی محنت و عرق ریزی سے پڑھا اور تحقیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا اور
ان میں سے غلط اور غیر معتبر واقعات و روایات کو ڈھونڈ کر اور صحیح و معتبر روایات و واقعات میں
تدلیس اور ملمع سازی کر کے علمی و تحقیقی انداز میں اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر اعتراضات
کی بوچھار لگا دی اور اسلام اور اسلامی تاریخ و روایات کو اس قدر بدنما انداز میں پیش کیا کہ خود
مسلمانوں کو ان سے نفرت اور گھن آنے لگی، قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور خود آنحضرت ﷺ کی
ذات گرامی کوئی بھی ان مستشرقین کے اعتراض کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا کوئی زمانے میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ہولناکی سے سر سید احمد خاںؒ جیسا دردمند، اولوالعزم، عالی
دماغ اور مدبر انسان برآمد ہوا انہوں نے "اسباب بغاوت ہند'' لکھی جس میں بڑی ہمت

وجراٴت سے انگریزوں کے مظالم کا تذکرہ کیا، وہ زندگی بھر قوم کی فلاح و بہبود کے لئے فکر مند رہے، ان کا دل قوم کے درد سے معمور اور اس کی پسپائی اور خستہ حالی پر نہایت مغموم اور اشک بار تھا مگر ان کا دور اندیش ذہن اور دور بیں نگاہ دیکھ رہی تھی کہ اب ملک میں انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو چکی ہے، اس کو اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں، اس لئے ان سے صف آرائی کا موقع نہیں رہا۔ جو لوگ اس طرح کا اقدام کریں گے وہ پہلے کے بعض پر جوش مجاہدین کی طرح پسپا ہو جائیں گے، اس لئے اب انگریزوں کے دوست بن کر ہی قوم کو عزت و سربلندی اور اس کی کھوئی ہوئی منزل مل سکتی ہے۔

سرسید نے بڑے اخلاص اور نیک نیتی اور نہایت دردمندی اور دل سوزی سے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی اور ان کا مستقبل درخشاں اور تابناک بنانے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لئے جو وسیع و ہمہ گیر تحریک شروع کی، اس کے دائرے میں مذہب، اخلاق، سیاست، معاشرت، ادب، تعلیم، ثقافت، تمدن اور معیشت وغیرہ تمام چیزیں شامل تھیں، پروفیسر خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں۔

”ہندوستان کے مسلمانوں کی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی فکری، علمی سماجی، مذہبی، سیاسی اور ادبی تاریخ کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس پر سرسید اور علی گڑھ تحریک نے بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے اثرات نہ چھوڑے ہوں، سرسید اور ان کے رفقاء کے لئے مدرسۃ العلوم ایک تعلیمی درس گاہ، نئے فکری رجحانات کی ایک علامت، احیائے ملی کی ایک تحریک کا نام تھا۔ یہاں آدم گری بھی ہوتی تھی اور تعمیر ملت کا سامان بھی مہیا کیا جاتا تھا یہاں وقت کے اشاروں کو سمجھنا بھی سکھا جاتا تھا اور اس کو دھاروں میں جوڑنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جاتی تھی، سرسید کی بلند حوصلگی، عزم راسخ، خلوص نیت اور جہد مسلسل نے اس مشکل اور متنوع کام کو ایک تحریک کی شکل دے دی تھی، زمانے کے پیچ و خم کے ساتھ تحریک کے خدوخال بھی بدلتے رہے، لیکن سرسید کے افکار کی معنویت ہر دور سے

لئے بڑھتی ہی رہی۔“

وہ نئے حالات سے اچھی طرح باخبر تھے، انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ مسلمان لکیر کا فقیر بن کر ترقی نہیں کر سکتے بلکہ جدید تعلیم حاصل کر کے ہی ترقی یافتہ قوموں کے برابر ہو سکتے ہیں اس لئے زندگی کی نئی روح ان میں پھونکنے کے لئے ان کی نسلوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہا اور انہیں بتایا کہ اگر اس کی جانب سے غفلت اور کوتاہی برتی گئی تو اس کی تلافی مدتوں نہیں ہو سکے گی، اس لئے انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمان جدید تعلیم سے لیس ہو کر نئے عہد کے تقاضوں کو پورا کریں اور نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں، ان کا یہی کالج ان کی وسیع و ہمہ گیر تحریک کا مرکز بنا۔

سرسید کی تحریک نے اردو کے علمی و ادبی ذخیرے کو بھی مالا مال کیا، انہوں نے جدید علوم اور نئے افکار و رجحانات سے قوم کو واقف کرانے کے لئے انگریزی زبان کی مفید تالیفات اور جدید علوم کی مغربی کتابوں کے اردو ترجمے کرائے، اس کے لئے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ جس کی طرف سے اپنے خیالات کی اشاعت، اپنی تحریک کو روشناس کرانے اور قوم میں انگریزی زبان اور سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا جو پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہو گیا تھا، بعد میں ان ہی مقاصد کے لئے علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سرسید کو سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی تحریک نے جدید اردو ادب، مقالہ نویسی اور سلیس اور سادہ نثر نگاری کو رواج دیا، مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

”سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل

ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اسی زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک نصیب نہیں، ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا تاہم سرسید کی فیض پذیری سے آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔" (۱)

سرسید کی مقناطیسی شخصیت کے گرد متعدد حضرات جمع ہو گئے تھے۔ جو ان کے ساتھ مل کر ان کے مشن کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے اور اپنی تحریر و تقریر سے ان کی تحریک کو قوت پہونچا رہے تھے، ان کے رفقاء میں نواب محسن الملک، وقار الملک، مولوی حالی، مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ پیش پیش تھے، ان کے بعد بھی ان کے متعدد جاں نثاروں نے ان کی تحریک کو توانا اور تازہ رکھا اور اب تک اس تحریک کی چھاپ قوم پر باقی ہے۔ سرسید کے تمام رفقاء مخلص اور لائق و فائق تھے۔

ایک زمانہ تک مولانا شبلی بھی سرسید کے زیر اثر رہے اور اس سے ان کو فائدہ بھی ہوا مگر وہ بڑے متحرک، فعال اور ذہین تھے ان میں ایجاد و اختراع کا مادہ، ابداع و ابتکار کی صلاحیت اور فکر و اجتہاد کا ملکہ تھا، اس لئے وہ اکثر امور و مسائل میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے، چنانچہ وہ زیادہ دور تک سرسید کا ساتھ نہیں دے سکے، قوم کی اصلاح و ترقی اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی دونوں کے پیش نظر تھی مگر نقطۂ نگاہ اور طریقۂ کار جدا ہو گیا تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس پر مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مقالات شبلی (ادبی) جلد دوم مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء

"مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا، ہر چیز میں انگریز ہو جائیں اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد کی حفاظت و بقا کے ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے"۔ (۱)

ایک اور تجزیہ نگار اور مبصر ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ہے کہ:

"شبلی اور سرسید دونوں مقاصد میں ہم آہنگ تھے، اگرچہ زاویۂ نظر میں دونوں کا اختلاف تھا، سرسید اپنے زمانے کی تہذیب اور اپنے زمانے کے علوم سے مفاہمت کے قائل تھے اور شبلی مفاہمت کے بجائے مقابلے کو ضروری خیال کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کی جو حالت ہوئی اس سے متاثر ہو کر سرسید نے ہر شعبہ میں مفاہمت اختیار کی تعلیم و تربیت کے میدان میں بھی مفاہمت ہی ان کا اصول تھا، اس طرح دینی فکر میں بھی انہوں نے مفاہمت کو اپنے مد نظر رکھا، اسے کوئی اچھا یا برا کہے لیکن اپنے زمانے کے حالات کے تحت سرسید نے نیک نیتی سے مفاہمت ہی میں مسلمانوں کی بہتری خیال کی اور اس پر قائم رہے، اس کے اچھے نتائج بھی نکلے اور برے بھی لیکن آج اچھے اثرات ہی کا ذکر کرنا چاہئے کیوں کہ ساری چیز خلوص اور نیک نیتی ہی سے کی گئی۔

اس کے برعکس شبلی مذکورۂ بالا مفاہمت کے بجائے مقابلے کے اصول میں اعتقاد رکھتے تھے، وہ یہ مانتے تھے کہ وقت کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے لیکن اس کے ساتھ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ محض مفاہمت کوئی چیز نہیں، ترقی بھی لازمی ہے، وہ کہتے تھے اس پرانی دعوت کو جسے اسلام کہتے ہیں اور اس روایت کو جسے اسلام نے پیدا کیا آگے بڑھانا ضروری ہے، وقت کے چیلنج کو قبول کرنے کا مطلب جھک جانا نہیں بلکہ دوسروں کے افکار کو سمجھ کر ان کا مقابلہ کرنا اور ان کے مقابلے کے لئے ہتھیار تیار کرنا تھا، شبلی اسی اصول پر قائم تھے۔

شبلی ایسے مستقبل پر نظر رکھتے تھے جو ماضی سے ہم آہنگ ہو لیکن سرسید محض مستقبل پر

(۱) حیات شبلی ص ۲۹۰

نظر رکھتے تھے، وہ روایت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، ان کے خیال میں ہر زمانہ اپنی روایات خود پیدا کرتا ہے، شبلی کے نزدیک روایت اور روایاتِ ملّی تاریخ سے بطور ورثہ منتقل ہوتی ہیں ان کا یہ خیال تھا کہ ترقی کا ہر قدم ماضی کی اساس پر ہونا چاہئے''۔

یہ بحث ضمناً آگئی، مقصد سرسید کی تحریک کی وسعت اور پھیلاؤ کو دکھانا تھا جس کا ایک مظہر ان کے مخلص اور گوناگوں خدمات انجام دینے والے ان کے رفقا بھی تھے، جن میں مولانا شبلی بھی تھے گو بعد میں وہ ان سے الگ ہوگئے تھے مگر سرسید کے اثرات ان پر بھی پڑے جس کا اعتراف مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی ہے، لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ سرسید کی صحبت میں مولانا میں جو پہلے ہی سے علوم عقلیہ سے دلچسپی رکھتے تھے، مذہبی عقل پسندی آگئی تھی اور عقل ونقل کی تطبیق کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اور اشاعرہ کے بہت سے مسائل کی خامیاں یا غلطیاں ان کو نظر آنے لگی تھیں''۔(۱)

سرسید کی نیک نیتی اور اخلاص کا ذکر و اعتراف بھی مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا ہے کہ ان کا مقصد قوم کو ذلت و پستی سے نکالنا، اس میں سیاسی شعور اور قومی بیداری پیدا کرنا تھا، وہ قوم کو وقت اور حالات کے ساتھ چلانا اور دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کا ہم سر بنانا چاہتے تھے، اسی لئے انہوں نے تعبیر و بیان کے لئے علمی، عقلی، معروضی اور سائنٹفک انداز اختیار کیا اور قوم میں نئے خیالات و رجحانات کو پرورش کرنا چاہا، فرسودہ روایت اور پرانی روش سے انحراف و بغاوت پر آمادہ کیا، قدامت کے بجائے جدت پر ابھارا اور ماضی کے بجائے بہتر مستقبل کی تعمیر و تشکیل کا منصوبہ بنایا۔

مذہب اور اس کے امور و مسائل کی اس نئی تعبیر و تشریح میں ان سے بعض غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان کے نقطۂ نظر سے قدیم فکر و خیال کے علما ہم آہنگ نہیں ہوسکے، علاوہ ازیں قوم کا بڑا طبقہ اس وقت فرسودہ روایات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا، وہ سرسید کی روشن خیالی اور جدت پسندی

(۱) حیات شبلی ص ۲۸۵۔

کا ساتھ دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوسکا، اس لئے ان کو شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان میں بڑا عزم و استقلال تھا اور وہ دھن اور ارادے کے پکے تھے، اس بنا پر مخالفتوں سے گھبرانا تو درکنار انہوں نے ان کی کوئی پروا بھی نہیں کی اور پورے صبر و سکون سے اپنے کاموں میں مشغول رہے۔

سرسید کی ان کوششوں سے مسلمانوں کا بہت کچھ بھلا ہوا، ان کا ملک میں وزن و وقار قائم ہوا جس طرح طبقۂ علما کی کوششوں سے ہندوستان میں اسلامی علوم اور دینی روح باقی رہی۔

اس زمانے میں سائنس اور قوانینِ فطرت کے نئے اسرار کے انکشاف سے مذہب کے بارے میں جو شکوک و شبہات ذہنوں میں پیدا ہورہے تھے اور مستشرقین اسلام پر جو ناروا اور رکیک اعتراضات کررہے تھے چونکہ سرسید اور ان کے رفقا جدید علوم و خیالات اور نئے رجحانات و افکار سے کسی حد تک واقف تھے اس لئے ان شکوک و اعتراضات کا جواب بھی دیا، سرسید نے سر ولیم میور کے جواب میں خطبات احمدیہ لکھی، اس کے علاوہ انہوں نے اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے بھی بعض کتابیں اور متعدد مضامین لکھے مگر اس میدان میں بھی ان کو ٹھوکر لگی جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہ تھے اور اس کے لئے جس دینی روح اور اسلامی حکمت و بصیرت کی ضرورت تھی وہ ان میں نہیں تھی، اس کے علاوہ یہ مغربی افکار و خیالات اور یورپ کے علوم و تہذیب سے مرعوب تھے اور اسی کی نقل و تقلید کو مسلمانوں کی کامیابی سمجھتے تھے، ان کے رد و قبول کا اصل معیار مغرب تھا، وہ اپنے زمانے کی طبیعی تحقیقات، سائنسی تجربات اور ان کے قیاسی نتائج کو قطعی اور یقینی مانتے تھے اور مسائلِ شرعیہ کو بھی ان کے مطابق کرنے لگے تھے اور جب اعتراضات کا جواب نہیں بن پڑتا تو اسلامی عقائد و تعلیمات اور دینی حقائق و اصول کی نہایت دور از کار تاویل و توجیہ کرتے تھے، اسی طرح کی غلطی یونانی فلسفہ کے اعتراضات کے جواب میں قدیم متکلمین، فلاسفہ، معتزلہ اور فرقہ باطنیہ بھی کرچکا تھا۔

دراصل مستشرقین اور فضلائے مغرب کے اعتراضات کا جواب وہ علما دے سکتے ہیں جو دینی علوم کے ماہر اور اسلامی تاریخ وروایات سے واقف ہوں، اصلی اسلامی روح اور گہری دینی بصیرت رکھنے کے ساتھ ہی وہ جدید مسائل وتحقیقات، نئے فلسفہ وکلام اور عصرِ حاضر کے افکار ورجحانات سے بھی باخبر ہوں اور ان کو نئے علمی اور سائنٹفک انداز، تلاش وتحقیق اور نقد ونظر کے جدید طریقوں اور مغربی زبانوں سے بھی واقفیت ہو مگر یہ خصوصیات نہ اس وقت کے قدیم علما میں موجود تھیں اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی ان خوبیوں کا حامل تھا۔

قدرت نے یہ دونوں خصوصیات اس وقت مولانا شبلی کی ذات میں جمع کر دی تھیں انہوں نے قدیم طرز کے علما سے دینی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن جدید طبقے کے لوگوں سے بھی ان کا اختلاط تھا، ان کو دونوں طبقوں کے فضلا کی صحبتوں میں رہنے کا اتفاق اور ان کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا، ان میں جہاں اصل اسلامی روح اور صحیح دینی بصیرت موجود تھی اور وہ اسلامی علوم پر مکمل عبور اور اسلامی تاریخ وتہذیب پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے، وہاں نئے حالات ورجحانات، تازہ افکار وخیالات اور جدید مسائل وتحقیقات بھی ان کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں تھے، چنانچہ ان کے زمانے میں مستشرقین جو اعتراضات بڑے شد ومد سے کر رہے تھے وہ ان سے واقف تھے اور ان کے بڑے مدلل اور محققانہ جوابات دیئے اور اسلام، اسلامی علوم ونظریات اور اسلامی تاریخ وتمدن کو ایسے پراثر اور دل نشین انداز میں پیش کیا کہ معترضین و مخالفین بھی ان کی عظمت وبرتری ماننے کے لئے مجبور ہوگئے، انہوں نے مسلمانوں کے گزشتہ شاندار واقعات اور کارنامے بیان کرکے قوم میں نئی روح پھونک دی اور اس کی مایوسی وافسردگی کو امنگ وحوصلہ میں تبدیل کر دیا، مستشرقین کے حوالوں، استنباط اور نتائج وتحقیقات کی غلطیاں اور کمزوریاں دکھا کر اور ان کی تدلیس وملمع کاری کا پردہ چاک کرکے واقعات وروایات کو ان کی اصل شکل اور صحیح صورت میں سامنے کر دیا، اس سے ان کی ساری بدنمائی اور کراہت دور ہوگئی اور

فضلائے مغرب کا جعل وفریب واضح ہوگیا۔

مولانا نے یورپ کے علما کی خباثت اور بدنیتی دکھانے اور ان کے پیدا کردہ شکوک و شبہات رفع کرنے کے لئے جو معرکہ آرا مضامین لکھے ان میں مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، الجزیہ، کتب خانۂ اسکندریہ، الانتقاد علی التاریخ التمدن الاسلامی، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آج تک عیسائی اہل قلم ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں، اسی طرح مسلم سلاطین کے شاندار علمی وتمدنی کارنامے بیان کرنے کے لئے بڑی تحقیق و تدقیق اور جاں فشانی سے اسلامی کتب خانے، اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات اور تزک جہاں گیری وغیرہ جیسے اہم مضامین لکھے۔

مولانا کی اکثر تصانیف معترضین کا مدلل جواب ہیں، ان میں بحث ونظر اور تلاش وتحقیق کا وہی انداز اور معیار ہے جو یورپ کے فضلا کی تصانیف کا ہوتا ہے، ان میں مسائل کی تحقیقات میں بڑی دقتِ نظر، باریک بینی اور وسعتِ نظر سے کام لیا گیا ہے اور نادر کتابوں اور نامعلوم گوشوں سے کمالِ نکتہ سنجی ودقیقہ سنجی سے ایسے حقایق ونتائج نکالے گئے ہیں جو عہدِ حال کے اقتضا کے مطابق ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے معترضین کے سارے اعتراضات درہم برہم ہوگئے ہیں۔

مولانا شبلی اگرچہ فطری ادیب ومصنف تھے، لیکن علی گڑھ کی فضا اور سرسید کی صحبت میں ان کا یہ جوہر اور کھل گیا تھا، اس زمانے میں علما کی اصل تصنیفی زبان عربی یا فارسی تھی، اس وقت تک اردو میں لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا، لیکن مولانا نے عربی وفارسی چھوڑ کر اردو میں تصنیف و تالیف شروع کی، جس کے بعد اس میں لکھنا پڑھنا عار نہیں رہ گیا، یہاں تک کہ بعض علما نے بھی اس میں مذہبی کتابیں لکھیں جو مذہبی موضوعات پر ہونے کی وجہ سے بلند اور نادر خیالات و مضامین پر مشتمل اور مفید تھیں مگر علمی وفنی اصطلاحات سے بوجھل، فلسفیانہ گتھیوں سے پُر، طرزِ ادا کی پیچیدگی اور دقیق ومشکل تعبیر وبیان کی وجہ سے عوام تو درکنار خواص کے لئے بھی ان کو سمجھنا اور

سمجھانا دشوار تھا لیکن مولانا شبلی کی محققانہ تصنیفات اور عالمانہ مقالات کی زبان نہایت سلیس اور شگفتہ، عبارت رواں اور صاف، طریقۂ بیان، سہل اور ہموار، الفاظ سادہ اور عام فہم اور ترتیب نہایت موزوں ہوتی تھی، انہوں نے تشبیہات و استعارات کے برمحل استعمال اور اپنی خوش بیانی و نکتہ سنجی سے ایک ایسا طرز و اسلوب ایجاد کیا جس سے ہر شخص ان کی تحریر سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے، ان کی ساری تحریریں چاہے وہ کسی دقیق اور غامض موضوع ہی پر کیوں نہ ہوں ادب و انشا کا اعلا نمونہ سمجھی جاتی ہیں، اور اہل قلم حضرات ان کے طرز تحریر و انشا کی تقلید کرنے کے لئے مجبور ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول ''علمی و مذہبی علوم کی ٹکسالی زبان اس کو سمجھا جاتا ہے''۔

اس زمانے میں علما کے موضوعات متعین و محدود تھے، فقہ و کلام کے اختلافی مسائل میں موشگافی اور فرق باطلہ کی تردید انکے قلم کی خاص جولان گاہ تھی لیکن مولانا شبلی نے ہر قسم کے علمی، دینی، تاریخی، فقہی، کلامی، فلسفیانہ، ادبی، تنقیدی،، تمدنی اور سیاسی مسائل پر مضامین و تصنیفات کے انبار لگادیئے، غرض ان کے قلم نے ہر زمین میں گل بوٹے کھلائے، وہ شاعر بھی تھے ان کی سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور قومی نظموں کی اثر انگیزی اور کیفیت اب بھی باقی ہے، اردو سے بڑھ کر فارسی کے شاعر تھے، ان کے فارسی کلام پر اساتذۂ ایران کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے، سخن فہمی اور سخن سنجی میں اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا کے زمانے میں بحث و مناظرے کی گرم بازاری تھی اور علما کا سب سے دلچسپ اور محبوب مشغلہ یہی تھا، گو مولانا کی اکثر تصانیف اور اہم مقالات بھی عیسائیوں، مستشرقین، ہندو معترضین اور بعض مذہبی فرقوں کی تردید اور جواب میں ہیں لیکن ان میں کہیں مناظرانہ رنگ نہیں آنے پایا ہے اور نہ قیل وقال اور جوابی الزامات ہیں، انہوں نے مناظرہ کی بدنما شکل اور جنگ کا نقشہ بدل دیا اور رد الزام اور رد جواب کے چکر میں پڑنے کے بجائے اپنے دعووں کو دلچسپ، دل نشین، مدلل، محققانہ اور سائنٹفک انداز سے بیان کرکے حریف کو جواب دینے کے لائق ہی نہیں چھوڑا ہے۔

ان کے زمانے کے علما پر مدرسیت کا غلبہ تھا اس لئے وہ صرف درسی کتابوں اور ان کے شروح و حواشی سے سروکار رکھتے تھے اور ان سے آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ غیر درسی کتابوں سے استفادہ کریں اور قلمی اور نادر کتابوں کی تلاش و جستجو کریں مگر مولانا شبلی نے ہر علم و فن کی کتابیں بہ کثرت پڑھیں، مخطوطات اور نوادر کا پتہ لگانے اور ان سے معلومات فراہم کرنے کے لئے بعض ملکوں کے سفر کئے، کتب خانے چھانے، دنیا کے گوشے گوشے سے جدید مطبوعات منگوائے اور ہر ہر فن کی بے شمار کتابیں جمع کیں، جن کے حوالے اپنی تصنیفات و مضامین میں دیئے، نصابِ تعلیم میں ان کو داخل کرایا، علما و طلبہ کو ان کے مطالعہ کا شوق دلایا، انہیں اس کا ملال تھا کہ یورپ کے فضلا تو اسلامی لٹریچر کے مشتاق ہیں اور مسلمانوں کے علوم و فنون کی نادر کتابیں نہایت جاں فشانی سے ڈھونڈ کر تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں لیکن ان کتابوں کے اصل وارثوں کو اپنے خزانوں کا پتہ نہیں، نہ ان کی تلاش و جستجو ہے اور نہ ان کے مطالعہ و اشاعت سے کوئی دلچسپی ہے۔

مولانا کے دل میں دار المصنفین کے قیام و تاسیس کا داعیہ اسی لئے پیدا ہوا تھا کہ چراغ سے چراغ جلتا رہے اور مصنفین اور علمائے محققین کی ایک ایسی جماعت تیار ہوتی رہے جو قدیم علوم کی ماہر بھی ہو اور جدید فلسفہ و کلام اور نئے افکار و رجحانات سے بھی بڑی حد تک آگاہ ہو، تاکہ نئے زمانے میں اسلام کی نئی ضرورت پوری کرنے کے لئے قوم کو افراد مہیا ہوتے رہیں، خود انہوں نے اپنے بعد اپنے لائق اور قابلِ فخر تلامذہ کی ایک جماعت چھوڑی تھی جس کے سامنے تصنیف و تالیف کا اپنا ایک مخصوص لائحۂ عمل رکھا تھا، الحمدللہ یہ جماعت اب بھی اپنے محدود وسائل و ذرائع کے باوجود ان کے اعمالِ متروکہ کی تکمیل میں لگی ہوئی ہے۔

علماء کی جامد سطح میں حرکت و انقلاب اور نئے خیالات و رجحانات کی پرورش کے لئے مولانا شبلی عربی تعلیم کے مروج پرانے نصابِ تعلیم میں اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے، تعلیم جدید

ے مرکز میں رہنے اور برسوں کے تجربے کے بعد ان کا خیال یہ ہوگیا تھا کہ نئے دور میں اسلام کی نئی ضرورتیں عصری درس گاہوں کے فضلا نہیں پوری کر سکتے بلکہ وہ تو خود ہی نئے سیلاب میں بہہ جائیں گے کیوں کہ جدید تعلیم اسلام کے بارے میں ان کے اندر طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کررہی ہے، اسلام کی نئی ضرورت کو پورا کرنے کا کام علما ہی کا گروہ کرسکتا ہے بشرطیکہ تعلیم کے نصاب ونظام میں تبدیلی کرکے اس کو عصرِ حاضر کے اقتضا کے لائق بنادیا جائے۔

وہ مدارس سے یونانی منطق وفلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں اور انگریزی زبان اسی لئے داخل کرنا چاہتے تھے، تاکہ علما نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات سے واقف ہوکر اسلام کی بہتر خدمت انجام دیں، مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شکوک وشبہات کا مدلل اور تحقیقی جواب دیں، وہ نہ قدیم تعلیم کے خلاف تھے اور نہ جدید تعلیم کے، لیکن وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ عربی زبان کی تعلیم کا رواج اٹھتا اور انگریزی تعلیم کا رواج اعلا مسلمان خاندانوں میں بڑھتا جارہا ہے، اس لئے نئے تعلیم یافتہ لوگوں کی مذہبی واقفیت کا ذریعہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اس ثانوی اور سکنڈری واقفیت کے بعد وہ دوسروں کے اعتراضات وشبہات کا جواب دینے کے لائق تو درکنار خود ہی شکوک وشبہات میں گرفتار ہوجائیں گے، اس لئے وہ فرماتے تھے کہ جب ہماری قوم کے علما جدید فلسفہ اور جدید علوم کو براہِ راست اور بذاتِ خود نہ حاصل کریں ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملاحدہ اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے۔

دراصل مولانا ایک نئے علمِ کلام کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے جس کی بنیاد پرانے فلسفہ منطق کے بجائے عقل ودرایت اور تنقید وتاریخ پر تھی کیوں کہ نئے دور میں علمِ کلام کا اصل مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی جانب ہوگیا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جز اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا اور

خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درس گاہوں میں ان ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کرکے دکھانا ضروری قرار دیا گیا اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی وقومی برتری کا اعلان کریں اور اپنے مقابلے میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ وتمدن کے روشن چہرے پر نئے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیر دیں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے اور اہل یورپ کے کارناموں کے سامنے ان کو اپنے مذہبی وتمدنی وسیاسی وقومی کارنامے پھیکے نظر آئیں اور اس طرح ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے ہمیشہ کے لئے مردہ ہوجائے"۔(۱)

سیرۃ النبی اسی سلسلے کی کڑی اور علمِ کلام کی کتاب ہے، وہ تاریخ وکلام اور فلسفہ کی وادیاں قطع کرنے اور امام غزالی اور ابن رشد کے کوچوں کو چھاننے کے بعد بارگاہِ نبوت میں پہنچے تھے، ان کے نزدیک یہ کتاب اسلام کے کلمۂ طیبہ کے دوسرے جز محمد رسول اللہ کی تشریح وتفسیر ہے، وہ خود رقم طراز ہیں:

"اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی اور علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن جب اقرار نبوت بھی جزءِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے"(۲)۔

غرض مولانا شبلی کی ذات مجموعۂ کمالات اور ان کی زندگی گوناگوں علمی وعملی کارناموں کا مرقع ہے، ان کے قلم نے علم، مذہب، تاریخ، سوانح، تعلیم، اخلاق، سیاست، کلام، فلسفہ، شعرو ادب اور تنقید وتحقیق ہر میدان میں اپنے تابناک نقوش چھوڑے ہیں، اپنے ان کمالات کی بنا پر اگر وہ فخریہ یہ کہیں کہ۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

تو بے جا نہ ہوگا۔

(۱) حیات شبلی (دیباچہ) ص ۲۳ (۲) سیرت النبی (مقدمہ) ص ۷ طبع چہارم معارف پریس، اعظم گڑھ۔

افغانستان

(۲)

از: کلیم صفات اصلاحی ☆

(سلسلہ کے لئے دیکھئے معارف ماہ اگست ۲۰۰۲ء)

تاتاریوں کا خروج غزنویوں اور غوریوں کا اقتدار مٹنے کے بعد سیستان میں، مقامی بادشاہ مشرقی افغانستان کے علاقوں میں غوریوں کے مقرر کردہ امراء، ہرات میں آل کرت اور شمالی افغانستان میں خوارزم شاہی حکومت کر رہے تھے، چنگیز خاں منگولیا میں وسیع اقتدار قائم کر چکا تھا، حالانکہ یہ خطہ بالکل بے آب و گیاہ اور سایہ دار درختوں سے محروم تھا، جا بجا صرف مویشیوں کی چراگاہیں تھیں اور سرما و گرما دونوں موسم نہایت صبر آزما تھے (۱) صحرائے گوبی کے شمالی علاقوں میں چنگیز خاں کے آباء و اجداد عہدۂ سرداری پر فائز تھے (۲) چنگیز خاں کی فطرت میں شجاعت اور جوانمردی اور جہانبانی کے ساتھ ساتھ جہانداری بھی تھی اور اس نے یاسا کے نام سے حکومت کے قوانین و ضوابط بھی منضبط کئے تھے، جوینی نے تقریباً دس صفحات پر مشتمل اس کے قواعد نقل کئے ہیں (۳) چنگیز خاں کے عہد میں چند برسوں میں علاقہ تاتار، علاقۂ زنداں سے چمنستان اور بیاباں سے ایوان مسرت بن گیا تھا، کھانے پینے کے سامانوں میں بڑی فراوانی تھی اور ملک زراعت سے سرسبز و شاداب و آباد ہو گیا (۴) ۶۱۷ھ میں اس کے اور محمد خوارزم شاہ کے درمیان اختلاف ہوا، مؤرخین نے اختلاف کے کئی اسباب لکھے ہیں لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ خوارزم

(۱) چنگیز خاں ہیرلڈ لیب (ترجمہ اردو) ص ۸ (۲) ایضاً ص ۳۰ (۳) دیکھئے تاریخ جہانگشائی ج اول ص ۱۶ تا ۲۵ (۴) ایضاً ص ۱۵، ۱۶۔

☆ اسکالر دارالمصنفین، اعظم گڈھ

کے چند مسلمان تاجر تاتار گئے، عمال انہیں چنگیز کے پاس لے گئے، اس نے کپڑے خریدے، اس کے بعد ان کی واپسی کے وقت خوارزم کی عمدہ مصنوعات کی خریداری کے لئے سینکڑوں آدمی ان کے ساتھ کر دیئے، تاجروں کا یہ قافلہ خوارزمی سرحد پر فروکش ہوا تو یہاں کے حاکم غائر خاں نے ایک تاجر کو بلایا وہ نہ گیا، غائر خاں نے برافروختہ ہو کر قافلہ کا سارا مال روک لیا، اس واقعہ کی اطلاع علاء الدین محمد خوارزم شاہ کو ہوئی تو اس نے سامان ضبط کر کے ان کو قتل کرنے کا حکم دے دیا، ایک شخص جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، اس نے چنگیز خاں کو خبر دی، وہ سن کر جوش غضب سے لبریز ہو گیا اور کہلا بھیجا کہ انتقام کے لئے تیار ہو جاؤ (۱) حمد اللہ مستوفی کے بیان کے مطابق چنگیز خان نے غائر خاں کو قصاص کے لئے طلب کیا تھا اور خوارزم شاہ اس پر آمادہ نہ ہوا بلکہ قاصد ہی کو قتل کر دیا (۲) اس کے بعد چنگیز خاں لشکر جرار لے کر روانہ ہوا اور اترار پہونچ کر خوارزمی حکومت کے مختلف حصوں پر حملہ کے لئے علاحدہ علاحدہ امرا مامور کئے، جغتائی اور اکتائی کو اترار کے محاصرے پر مقرر کیا اور توشی اور تاتاری سرداروں کو ترکستان کی طرف بھیجا اور خود بخارا کی طرف بڑھا، جغتائی اور اکتائی نے طویل محاصرے کے بعد غائر خاں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اترار پر قبضہ کے بعد سمرقند روانہ ہو گئے، ادھر توشی اور الش ایدی نے بار چلیغ کنت، جند اور کند اور اشناس کو فتح کر کے ان شہروں کو لوٹا اور جند کے باشندے عدم مزاحمت کے سبب محفوظ رہے پھر یہ دونوں قراقرم واپس ہو گئے، تاتاری فوج نے نیکی کنت کر کا رخ کیا اور فنا کنت اور جخند وغیرہ کو زیر نگیں کرنے کے بعد لوٹ کر ویران کر دیا (۳) صوبہ ماوراء النہر خوارزمی سلطنت میں اپنی علمی، تمدنی اور سرسبزی و شادابی و دلکشی کی بناء پر ممتاز اور اہمیت کا حامل تھا اور اس کی اسی خصوصیت کے پیش نظر خوارزم شاہ نے اس کے حفاظتی انتظامات میں کوئی کسر باقی نہیں رکھا تھا (۴) چنگیز خاں نے اس پر خود فوج کشی کی اور زرنوق اور نور بخارا کو رام کرتا ہوا بخارا پہونچا، اس کے سخت محاصرے اور مقابلہ کی خوارزمی فوج اور اہل بخارا میں طاقت نہ تھی، علما اور عمائد

(۱) تلغیق الاخبار و تلقیح الآثار فی وقائع قزان و بلغار و ملوک التتار ج ا ص ۳۵۱ و تاریخ جہانگشائے ج ا ص ۶۱ و ۶۲ (۲) تاریخ گزیدہ ج اول ص ۴۵۷ (۳) یہ تفصیلات جہانگشائے جوینی ص ۶۵ تا ۷۰ سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ (۴) ابن اثیر ج ۱۲ ص ۱۴۰

شہر امان کے طالب ہوئے اس نے منظور کر لیا، لیکن خوارزمی فوج کا ایک حصہ قلعہ بند ہو کر تاتاریوں پر حملہ کرتا رہتا تھا تو چنگیز خاں نے پورے شہر کو آگ لگادی، بخارا کی تباہی کے ایک عینی شاہد کا یہ بیان ملاحظہ ہو

''آمدند و کندند و سوختند و کشتند و بردند و رفتند''(۱)

بخارا کو خاک میں ملانے کے بعد سمرقند کی طرف متوجہ ہوا، اس کے بھی سخت و مستحکم حفاظتی انتظام اور اہل سمرقند کی پامردی سے مدافعت کے باوجود چنگیز کی ستم آرائیوں کا سیلاب نہ رکا اور بخاری کی کل دولت لوٹ کر سمرقند پر بھی تسلط حاصل کر لیا (۲) اس زمانہ میں خوارزم شاہ بلخ میں تھا، امرا کے مشورے سے جنگ کی تیاری کے لئے اس نے بخارا سے عراق کا رخت سفر باندھا تھا کہ اس کو سمرقند و بخارا پر تاتاریوں کے قبضہ کی خبر مل گئی وہیں سے وہ نیشاپور چلا گیا، نیشا پور سے عراق کا ارادہ کیا، رے میں معلوم ہوا کہ تاتاری مستقل تعاقب کر رہے ہیں تو خوارزم شاہ قزوین کے راستے سے ماژندان کی طرف نکل گیا، سلطان نے دیکھا کہ تاتاریوں کے تعاقب سے نجات مشکل ہے تو بحیرۂ خزر کے جزیرہ آب سکون نکل گیا لیکن یہ وہاں بھی پہونچ گئے تو اس نے آب سکون کو چھوڑ دیا، سلطان کے اہل خاندان قلعہ ماژندان میں تھے، تاتاریوں نے ان پر قبضہ کر لیا (۳) سلطان نے ۶۱۷ھ میں جزیرہ آب سکون میں وفات پائی (۴) تاتاریوں نے ارگنج کو ویران کر ڈالا، اس کا خاندان تو اسیر ہو گیا تھا لیکن اس کا بیٹا نیشاپور اور بست ہوتا ہوا ہرات پہنچ گیا، اس کے بعد چنگیز نے ترمذ اور بلخ کو فتح کر کے تباہی مچائی اور اس کے بیٹے تولی نے مرو، بیہق اور نساء سے فیروزکوہ آستیہ اور تولک تک کے شہروں کو مسخر کر لیا، اس کے بعد ہرات، جوزجان، اندخود، میمنہ، فاریاب، بامیان نیز طخارستان کے شہروں کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۶۱۸ھ میں آخری خوارزم شاہ جلال الدین منکبرتی نے ہرات سے غزنہ پہنچ کر افغان رؤسا کی مدد سے ایک لشکر جرار جمع کیا اور پروان (موجودہ جبل السراج) میں تاتاری لشکریوں کو ہزیمت دی لیکن بدقسمتی سے خوارزم شاہ کے امرا میں اختلاف ہو گیا اور چنگیز بغرض انتقام طالقان فتح کر کے غزنہ

(۱) جوینی ج ۱ص ۸۳ (۲) ایضاً ص ۹۱ تا ۹۵ (۳) ایضاً ص ۹۶ و مابعد تاریخ ابو الفدا ج ۳ص ۱۲۹ ۔

تک بڑھ آیا۔ خوارزم شاہ نے نہایت جرأت مندانہ مقابلہ کیا، بیٹے اور حرم کام آگئے اور خود لڑتے ہوئے دریا عبور کر گیا (۱) چنگیز خاں نے تین ماہ تک قتل عام کیا اور ہر جگہ کی بغاوتوں کو بالخصوص نیشاپور کی فرو کیا، چغتائی کے ہاتھوں سندھ، مکران اور وادی کرم کے شہر تاراج ہوئے، ۶۱۹ھ میں چنگیز اپنے بیٹوں کے ساتھ ماوراء النہر لوٹ گیا، ۶۲۴ھ میں انتقال کر گیا اور افغانستان تولی خاں کے حصہ میں آیا (۲) چنگیز خاں نے ترمذ پر قبضہ کر کے پوری آبادی کو تہ تیغ کر ڈالا، ترمذ کے بعد بدخشاں، اس کے بعد بلخ، بلخ کے بعد خراسان اپنے لڑکے تولی خاں کو بھیجا خود طالقان کا رخ کر کے ترمذ و بلخ کی طرف اس کی آبادی کو بھی ختم کر کے شہر کو زمین کے برابر کر دیا، طالقان کے بعد بامیان کا بھی صفحۂ ہستی سے نام و نشاں مٹا دیا، بامیان کے بعد جلال الدین کے مقابلہ کے لئے غزنین پہونچا تو جلال الدین ہندوستان کے ارادہ سے نکل چکا تھا، ابھی دریائے سندھ کے ساحل ہی پر تھا کہ چنگیز نے محاصرہ کر لیا، سلطان مختصر سپاہ کے باوجود اس بہادری سے لڑا کہ تاتاریوں کی صفیں الٹ دیں (۳) جلال الدین کے ہندوستان جانے کے بعد غزنہ اور غور خالی پا کر چنگیز نے اس پر قبضہ کر لیا، اور ایک فوج جلال الدین کے تعاقب میں ہندوستان بھیجی، اس نے پنجاب تک کوشش کی لیکن سلطان ان کے گرفت میں نہ آسکا اور تاتاری پنجاب و ملتان کو لوٹتے ہوئے لوٹ گئے (۴)۔

ماوراء النہر پر قبضہ کر کے تاتاری خراسان، فارس، ارمنستان، کرج، قفچاق کے تمام علاقوں کو برباد کرتے ہوئے روس تک پہونچ گئے، اور پورے وسط ایشیاء میں پھیل گئے اور آذربائجان پر قبضہ کر کے دیار بکر، جزیرہ وغیرہ کو زیروزبر کر ڈالا اور لوگوں کے دلوں میں ان کی ظلم آرائیوں کی اس قدر ہیبت طاری ہو گئی تھی کہ تنہا ایک تاتاری گاؤں یا کسی بڑے مجمع میں گھس کر سب کی ایک ایک کر کے گردن اڑا دیتا اور کسی کو اس کے مقابلہ کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ (۵)

اس قدر کم مدت میں تاتاریوں کی توسیع مملکت کے سیلاب نے انہیں خلافت بغداد پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا اور سلطنت عباسیہ کے آس پاس کے ملکوں اور

(۱) دیکھئے تاریخ جوینی ج ۱ص ۱۳۴، ۱۳۵ و مابعد (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ص ۹۷۹، ۹۸۰ (۳) تاریخ جہاں کشائے جلد اول ۱۰۲ تا ۱۰۷ (۴) ابن اثیر ج ۱۲ص ۱۵۳ (۵) ایضاً۔

حکومتوں پر قبضہ بھی کرلیا تھا (۱) لیکن مستنصر کی فوجوں نے تاتاریوں کو پسپا کردیا (۲)۔ اس کی تفصیل ہمارے اس مقالہ کے موضوع سے باہر ہے یہاں ہم نے صرف افغانستان اور اس کے اطراف وجوانب پران کی تاخت کا حال لکھا ہے۔

افغانستان کے متعدد علاقوں پر مختلف سنین میں جن تاتاری فرمارواؤں نے حکومت کی ان کے نام یہ ہیں چنگیز خاں (۶۱۶ تا ۶۱۸ھ) اوکتائی بن چنگیز (۶۱۸ھ) چغتائی بن چنگیز (۶۱۸ تا ۶۳۹ھ) تولی بن چنگیز (۶۲۰ھ) قراہولاگو (۶۳۹ تا ۶۴۹ھ) (۳)۔

طبقات ناصری کے مصنف نے لکھا ہے کہ تاتاریوں کا خاتمہ سرزمین شام میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا اور یہی سرزمین دمشق وشام ان کی آخری حد ہے (۴)۔

آل کرت اور تاتاریوں کے عہد میں افغانستان کی سیاسی حالت

سلطان محمد غوری کے نہالی رشتہ داروں میں تاج الدین عثمان مرغنی اور عزالدین عمر مرغنی کا شمار معزز درباریوں میں ہوتا تھا، رکن الدین محمد بن تاج الدین کو تاتاریوں سے خوشگوار تعلق کی بناء پر خیسار، غور اور اس کے متصل علاقے سونپ دئے گئے تھے (۵) جب کہ طبقات ناصری میں ہے کہ قلعہ خیسار ایک نہایت مستحکم قلعہ تھا اور یہی تاج الدین عثمان مرغنی کا دارالحکومت رہا اور کسی شخص کو اس قلعہ پر دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ چنگیز خاں کی نگاہ ہمت بھی اس قلعہ تک نہ اٹھ سکی، یہ قلعہ ہرات کی مشرق میں تھا (۶) اس کی وفات کے بعد شمس الدین محمد مہین بن ابی کرت نے جسے تاتاریوں کا تقرب حاصل تھا، تاتاری سپہ سالار سالین نوئین کی مصاحبت میں لاہور اور ملتان کو زیرنگیں کرلیا، لیکن بعد میں جب اس پر مسلمانوں اور افغانوں کی نصرت وحمایت کا الزام لگایا گیا اور اسی سلسلہ میں وہ تاتاریوں کا مورد عتاب ٹھہرا تو اپنے ہمدرد منکو خاں کے دامن میں پناہ لی اور اس نے قدیم تعلقات کے باعث سندھ اور خراسان تک (موجودہ افغانستان) کا

(۱) ابن خلدون ج ۳ ص ۶۳۲ (۲) تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۴۷۳ (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۰ (۴) ج ۲ ص ۳۶۹ (اردو ترجمہ غلام رسول مہر) (۵) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۱ (۶) خلافت مشرقی، مولف لی سترنج بحوالہ طبقات ناصری (اردو ترجمہ) ص ۳۸۳ جلد دوم۔

علاقہ اس کے حوالہ کردیا ۶۴۷ھ میں طالقان، اسفرار، خاف، گرزیون، تولک، فراہ اور سیستان وغیرہ کے علاقے فتح کر لئے ۶۴۸ھ میں اس نے افغانستان (۱) پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا، اس وقت فخر الدولہ والدین ملک شاہنشاہ اس پر حکومت کررہا تھا جس کی راجدھانی مستونگ تھی، شمس الدین نے اس کی شرائط صلح مسترد کرکے ۶۵۲ھ میں دارالسلطنت مستونگ کا محاصرہ کرلیا اور شدید جنگ کے بعد شاہنشاہ اپنے لڑکے بیرم شاہ اور دوسرے اہالیان سلطنت سمیت مارا گیا تاہم اس کا داماد میران شاہ بچ نکلا لیکن ۶۵۸ھ میں شمس الدین کے خلاف ایک معرکہ میں ہلاک ہو گیا (۲) قلعہ تیری افغانوں کا ایک نہایت مستحکم قلعہ تھا، اس کے سردار المبارز نے طائر بہادر اور نوئین کو متعدد بار شکست دی تھی ۶۵۳ھ میں شمس الدین نے المبارز افغان کو قتل کرکے قلعہ تیری کو حسام الدین جامل کے حوالے کردیا، اسی سال قلعہ بکھیرادوکی کو شدید جنگ کے بعد فتح کیا اس کے بعد قلعہ ساجی کو زیرنگیں کرکے شمس الدین نے پورے افغانستان کو ۶۶۲ھ میں اپنے قبضہ میں کرلیا، اس زمانہ میں ہرات چنگیزی شاہزادوں کی خانہ جنگی کا شکار تھا، شمس الدین نے خیسار میں اقامت اختیار کرلی، چنانچہ آباقاں خاں نے اپنے قدیم مقبوضات شمس الدین کے نام جاری کرکے اسے ۶۷۲ھ میں ہرات بلالیا لیکن ۶۷۶ھ میں تبریز میں اسے زہر دے دیا گیا اور اس کا بیٹا ملک رکن الدین (الملقب بہ شمس الدین کہین) تخت نشین ہوا، اس نے چنگیزی امراء سے دوستی برقرار رکھی، ۶۷۸ھ تک غور اور خیسار کو اور ۶۸۰ھ میں قندھار کے قلعے فتح کرلئے، اسکے لڑکے فخر الدین کی حکومت امیر غازان خاں نے ہرات سے دریائے سندھ تک تسلیم کرلی، اس کی وفات کے بعد امیر اولجاتیو نے ہرات، سبستان، غرجستان وغیرہ کے علاقے اس کے بھائی غیاث الدین محمد کے سپرد کردئے (۳) رشیدی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ شمس الدین کی وفات کے بعد جب اس کا پوتا فخر الدین اس کا جانشین ہوا تو ایرانی مغول شاہوں کی حکومت زوال پذیر تھی، اس وقت ملوک کرت کی طاقت بام عروج پر تھی اور فخر الدین کے تعلقات امیر چوبان سے تھے، ایران کے ایلخانی بادشاہ ابوسعید بہادر خان کی کم سنی

(۱) جس کا اطلاق ان دنوں قندھار اور غزنی سے دریائے سندھ تک کے علاقے پر ہوتا تھا (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۱۔ (۳) تاریخ نامہ ہرات ۳۶۸، ۳۶۹، سیف بن محمد بن یعقوب ہروی مطبوعہ بپٹسٹ مشن کلکتہ ۱۹۴۳ء و اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۱۔

میں نائب السلطنت تھا(۱) چنانچہ جب ابوسعید بہادر نے خاندان چوبان کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو کم کرنے کے لئے اس پر حملہ کیا تو غیاث الدین کے یہاں اس نے پناہ لی لیکن بعد میں دھوکہ سے ۱۳۲۷ء میں اس کے لڑکے جلوں خان کے ساتھ اس کو قتل کرڈالا(۲)۔

غیاث الدین کے انتقال کے بعد شمس الدین ثانی اور حافظ یکے بعد دیگرے اس کے جانشین ہوئے، یہ دونوں بالترتیب ۱۳۲۹ء/۷۳۰ھ اور ۱۳۳۱ء/۷۳۲ھ میں فوت ہوگئے حافظ اور اس کا تیسرا بھائی معزالدین تخت حکومت پر متمکن ہوا، ۱۳۷۰ء/۷۷۲ھ میں اس کا انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا غیاث الدین پیر علی تخت نشین ہوا(۳) ۱۳۸۱ء مطابق ۷۸۳ھ میں امیر تیمور نے ہرات کی جانب یلغار کی اور چندروز محاصرہ کرنے کے بعد اس کے بڑے بیٹے پیر محمد کو گرفتار کرلیا اور شہر کی فصیلیں اور قلعے وغیرہ برباد کردیے، ہرات کے آہنی دروازے کو سمرقند منتقل کردیا گیا اور غیاث پیر علی کو تیمور کے باج گذار کی حیثیت سے ہرات پر حکومت کی اجازت مل گئی(۴) لین پول کے بیان کے مطابق ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ میں آل کرت کا سلسلہ اقتدار ایک عرصہ تک تیمور کا فرمانبردار رہ کر ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔(۵)

آل کرت کے علاوہ ہوتک امراء جنھوں نے ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول کے اختتام تک ترنگ کے کنارے قلات غلزئی میں حکومت کی، ان میں سے باباہوں تک ولد تولر (۶۶۱ تا ۷۴۰ھ) اور اس کے لڑکے شیخ ملک یار (۷۴۹ھ مطابق ۱۳۴۸ء) نے تاتاریوں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں بعد میں بارھویں صدی ہجری میں اسی خاندان نے قندھار کی ہوتکی سلطنت کی بنیاد رکھی۔(۶)

تیموریان ہرات کا تذکرہ | دنیا کے سیاسی منظر نامہ پر تیموریوں نے اپنی قابل ذکر تاریخ

(۱) جامع التواریخ، رشیدی ص ۶۹ طبع دختر خاں بابابیانی تہران ۱۳۱۷ھ (۲) ایضاً ص ۱۳۲ و مابعد۔ (۳) دی محمڈن ڈائنا سٹیز لین پول اردو ترجمہ مسلمان شاہی خاندان اور اس کے سلسلے ص ۲۶۵ (۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۷ ص ۱۵۰ (۵) لین پول حوالہ مذکور۔ (۶) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۲۔

چھوڑی ہے، تیمور جس کی طرف اس خاندان کا انتساب ہے اس کا تعلق کسی شاہی خاندان کے بجائے مغلوں کے قبیلہ برلاس سے تھا اس کے اور چنگیز خاں کی اصل ایک تھی(۱) اس خاندان کی شاندار سیاسی تاریخ ہندوستان سے وابستہ ہے تاہم یہاں صرف ان ہی واقعات کا بالاجمال تذکرہ کیا جائے گا جن کا براہ راست تعلق موجودہ افغانستان سے رہا ہے، تیمور کی وسیع مملکت اور اس کی جہانبانی کی داستان دلچسپی سے خالی نہیں۔ جس کو کلاویجو نے اس طرح بیان کیا ہے، یہ بیان اس لئے مستند ہے کہ کلاویجو تیمور کے دربار کا عینی مشاہد ہے لکھتا ہے۔

''تیمور نے مغلوں کے تمام علاقے، ہندوستان(۲) خراسان، خوارزم فارس، مغربی ایران مع تبریز وسلطانیہ، آرمینیہ، کوچک، روم، کردستان، دمشق، بابل، بغداد اور ان کے علاوہ بہت سے ممالک اور بادشاہوں کو زیر کرکے ان پر تسلط حاصل کرلیا''(۳)۔

تیمور نے ۷۸۲ھ میں دریائے آموپار کیا، اندخود سرخس اور فوشنج کو سر کرنے کے بعد ہرات کی تسخیر کا عزم کیا اور آل کرت کے آخری فرمارواغیاث الدین پیر علی کا خاتمہ کیا ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں سبزوار اور فراہ سے زرنج، سیستان بست اور قندھار پر تاخت کرکے سارے ممالک کو تیموری سلطنت میں داخل کرلیا(۴) ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء میں تیمور نے مشرق کا رخ کیا اور اپنے پوتے پیر محمد کو کابل، غزنہ اور قندھار کا والی بنا کر اپنے بیٹے شاہ رخ کو ولایت خراسان کی بادشاہت جاگیر کے طور پر عنایت کی جس کا صدر مقام اس زمانے میں ہرات تھا، پیر محمد نے کوہ سلیمان کے افغانوں پر چڑھائی کی، الفنسٹن کے بیان کے مطابق ۱۳۹۸ھ کے شروع یعنی ۸۰۰ء میں تیمور کے پوتے پیر محمد نے کوہ سلیمان کے پہاڑوں میں آباد پٹھانوں کو رام کرکے اچھ کے قریب اٹک پار کیا اور ملتان کا چھ مہینے تک محاصرہ کیا(۵) اسی زمانے میں پیر محمد نے تیمور کو لکھا کہ اس نے ملتان کو فتح کرلیا ہے جس کے بعد ہندوستان کو مسخر کرنے کا راستہ صاف ہوگیا ہے چنانچہ وہ اندراب سے کوہستان ہندو کش پر لشکر کشی کرکے پہلے کابل آیا وہاں سے سرکنڈوں کا پل باندھ کر اٹک اور جہلم کو عبور کیا اور

(۱) تاریخ ہندوستان، الفنسٹن ترجمہ ص ۶۷۴ (پانچواں حصہ، سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ ۱۸۰۷ء (۲) یعنی قدیم ہندوستان جس میں موجودہ افغانستان کے بیشتر علاقے شامل ہیں (۳) تمرلین ص ۵ مصنف ہیرلڈلیمب، مترجمہ محمد عنایت اللہ مطبع معارف اعظم گڑھ (۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۲۔ (۵) تاریخ ہندوستان الفنسٹن ص ۶۷۵۔

تلمیسان کو روندتا ہوا بیاس کے کنارے پہونچا (۱) اس یلغار میں بیچ کے ملکوں کو جگہ جگہ مطیع کرتا چلا گیا، چنانچہ لغمان سے دوسری طرف پلٹ کر سیاہ پوشوں اور کتور کیتر پر حملہ کے بعد اس نے باغی افغانوں پر چڑھائی کی اور دریائے سندھ کو عبور کیا، واپسی پر وہ درہ ٹوچی کے راستہ سے ہوتا ہوا بنوں سے گزرا تھا درہ ٹوچی کی راہ غلزئی اور وزیری قبائل کے علاقوں سے ہو کر گزرتی ہے (۲)

۷ اشعبان ۸۰۷ھ میں تیمور کے وفات کے وقت (۳) کابل میں پیر محمد حکمراں تھا لیکن خلیل ابن میران شاہ نے اس سے سلطنت چھین کر اس پر قبضہ کر لیا نتیجتاً جنگ ہوئی اور اس جنگ کا خاتمہ پیر محمد کے قتل پر ہوا تھوڑے عرصہ بعد شاہ رخ خلیل کو معزول کر کے خود تخت سلطنت پر براجمان ہو گیا اس کے چالیس سالہ دور حکومت میں رعایا نے نہایت پرامن زندگی گزاری اور ممالک محروسہ اپنی ماضی کی تباہی و بربادی کے باوجود سنبھلنے لگے، اس نے تمام چھوٹی بڑی بغاوتوں کو ختم کر کے اندحود شبرغان، طخارستان، ختلان، بلخ، بدخشاں اور سیستان کے علاقے اپنی سلطنت کے زیر انصرام کر لئے اور متعدد شاندار عمارتیں، خانقاہیں اور مدرسے بنوائے، ۲۵ ذی الحجہ ۸۵۰ھ کو اس نے وفات پائی (۴) اس کی وفات کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور تیموری شہزادگان باہمی رقابت و کشمکش کا شکار ہو گئے، یکے بعد دیگر الغ بیگ بن شاہ رخ (۸۵۰ تا ۸۵۳ھ) عبدالطیف بن الغ بیگ (۸۵۳ تا ۸۵۴ھ) اور بابر میرزا ابن بایسنقر بن شاہ رخ (۸۵۴ تا ۸۶۱ھ) وغیرہ تخت نشین ہوئے لیکن ان سب کا عہد مختصر تھا، یہ تیموری شہزادگان حصول اقتدار کے نشہ سے سرشار تھے اور تیموری سلطنت کے عدم استحکام کے سبب صفویوں اور سلطنت ازبکیہ کو عروج حاصل ہوا۔ (۵) ان کی باہمی چپقلش کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۸۶۱ھ میں جب سلطان ابوسعید تخت نشین ہوا تو خراسان و افغانستان کی حکومت کے سلسلہ میں حسین بن منصور بن بایقرا ابن عمر شیخ بن تیمور کے درمیان مخاصمت ہوئی اور ۸۷۰ھ میں اسے شکست ہوئی (۶) تیموری شہزادوں میں ابوسعید اچھے

(۱) منتخب التواریخ ص ۶۸ و تاریخ افغنستان ۶۷۶ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۲ (۳) منتخب التواریخ ص ۱۶۹ (۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۲ (۵) دی محمدن ڈائناسٹیز، لین پول (ترجمہ اردو) ص ۲۸۱ ۔ (۶) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۳۔

اوصاف و کمالات کا حامل تھا نیز فن جہانبانی سے بھی واقف تھا، اسکے اقتدار کا دائرہ ماوراء النہر ترکستان، کابلستان، زابلستان، خراسان اور مازندان تک وسیع تھا تاہم دریائے جیحون کے جنوب میں ازبکوں کی یورشوں کے فرو کرنے میں وہ ناکام رہا چنانچہ ۵۵-۱۴۵۴ء میں اویس بن محمد بن بایقرا نے ازبک سلطان ابوالخیر کی مدد سے اترار میں بغاوت کر دی جس کے استیصال میں ابوسعید کو شکست ہوئی، ۱۴۶۱ھ میں محمد جوکی بن عبداللطیف بن الغ بیگ نے ماوراالنہر کو برباد کرنے کے بعد شاہ رخیہ (تاشقند) میں پناہ لی، ابوسعید نے دس ماہ تک اسکا محاصرہ کیا تاہم کامیابی نہ ہوئی اور ازبک ہر سال ماوراالنہر کو تاراج کرتے رہے ادھر ۱۴۶۴ء/۸۶۸ھ میں سلطان حسین نے خوارزم میں پناہ گزیں ہو کر خراسان کو ابیورد اور مشہد سے لے کر تو ند تک بے باکانہ تہس نہس کر ڈالا (۱) لیکن جیسا کہ سطور بالا میں گذر چکا ہے کہ سلطان حسین کو ۸۷۰ھ میں شکست ہوئی ۱۴۶۸ء میں ابوسعید نے شاہ رخ کی وفات کے بعد تیموریوں کے قبضے سے نکلنے والے علاقوں کو واپس لینے کا پروگرام بنایا، جن پر ترکمانوں نے تسلط حاصل کر لیا تھا، اس مہم کا فیصلہ اس نے عجلت میں کر لیا تھا، اور پوری طرح فوجی تیاری بھی نہیں ہو پائی تھی، کہ ابوسعید آذربائیجان کے علاقے میں دور تک بڑھتا چلا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اوزون حسن نے اس کو گرفتار کر لیا اور چند روز بعد ایک تیموری امیر محمد نے اپنی دادی گوہر شاد کے قتل کے انتقام میں ابوسعید کو قتل کر دیا، (۲)۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا قائم مقام ایک دن کے لئے بھی خراسان پر حکومت نہ کر سکا، حسین بایقراء بلا کسی مزاحمت کے اپنے پایۂ تخت ہرات سے خراسان، سیستان، غور اور زمین دوار پر حکومت کرتا رہا، شاہ رخ اور حسین بایقراء کے دور حکومت میں ہرات کی شہرت علم و فن اور شعر و سخن کے اعتبار سے اوج کمال پر تھی، اور اس عہد کے مشاہیر علم و فن سے بزم ہرات آراستہ تھی، جن میں ملا حسین واعظ کاشفی، عبدالرزاق سمرقندی، مولانا جامی اور بہزاد نقاش کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حسین بایقرا کے آخری دور میں شمال کی جانب سے اس کے اقتدار کو شیبانی خان اور اس کے ازبکوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا، ۹۱۱ھ میں حسین بایقرا کی وفات کے بعد

(۱) اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۸۱۹ (۲) ایضاً ص ۸۲۰۔

ہرات کی مرکزی حکومت بدیع الزماں اور مظفر حسین کے ہاتھ میں آئی جس کو شیبک خان نامی ایک چنگیزی لٹیرے نے تاراج کیا اور افغانستان کے اقطاع الگ الگ حکومتوں میں منقسم ہوگئے۔

تیمور کی یلغار کی وقت کنڑ کے دروں میں مقامی خاندان کی حکومت تھی، سلطان پکھل بن کھجامن لغمان سے باجوڑ، سوات اور کشمیر تک کے علاقوں پر قابض تھا، اس کے فوت ہونے کے بعد اس کے لڑکوں کی باہمی کشمکش کے باعث پکھل کے بھائی بہرام نے اس کی سلطنت کو ہتھیالیا، جس کی حدود کابل سے کشمیر تک وسیع تھی، بہرام کے بعد زمام اقتدار سلطان تومنا کے ہاتھ آئی تاہم اس خاندان کی حکومت پہاڑی سلسلوں تک محدود تھی۔

تیموریوں کے زمانے میں متعدد افغان قبائل قندھار و گومل سے نقل مکانی کر کے کابل کے دروں میں مقیم ہوگئے۔ ۸۷۰ھ مطابق ۱۴۶۵ء الغ بیگ (حاکم کابل) نے یوسف زئی اور ان کے قبائل کو ختم کر ڈالا لیکن یوسف زئی کا بھتیجا احمد فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا، اس کے بعد حصارک میں یوسف زئی اور مہمند زئی قبیلوں میں جنگ ہوئی تو مہمند زئیوں نے ننگرہار کے اطراف پر تسلط حاصل کرلیا، یوسف زئیوں نے باجوڑ، بنیر اور سوات کی طرف رخ کر کے اشنغر (ہشت نگر، مرکز چارسدہ) کی پوری سرزمین اور پشاور کے شمالی دوآبہ اور ناوگی سے اوہنڈ تک کے علاقوں پر ملکیت حاصل کرلی، ان کے حکمرانوں میں شاہ ملی (شیخ آدم) بن یوسف علم و تقویٰ میں ممتاز اور ماہر قانون خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انہوں نے اجتماعی قوانین قومی اور تقسیم آراضی پر دفتر شیخ ملی (۱) کے نام سے ایک کتاب لکھی، ان کے بعد سلطنت پر کجو خاں کا قبضہ ہوگیا (۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء) اس نے شیخ چور میں غوریہ خیل اور لنگر کوٹ میں دلازاکوں کو مغلوب کیا، اس کے بعد اس خاندان کے دو فرماں رواؤں شاہ منصور بن سلیمان اور شاہ سلیمان کا نام ملتا ہے، ان میں موخر الذکر کی لڑکی سے بابر نے شادی کی تھی۔

تیموریانِ ہند اور ارغونیوں، ازبکوں اور صفویوں کا اقتدار

(۱۲۱۰ء) میں تاتار مغلوں نے اپنے وطن سے نکل کر ایشیا کے تقریباً پون حصے پر اپنی فتوحات کے پرچم لہرادیئے،

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۳۔

چنگیز خاں اور ہلاکو نے عرب و عجم کے اکثر ممالک پر غلبہ حاصل کیا، ان کے بعد امیر تیمور نے والگا سے گنگا کے کنارے تک مغلوں کی دھاک قائم کردی، یہ (۱۳۹۸ء) کا واقعہ ہے مگر اس کے بعد اس کی حکومت کے اجزاء منتشر ہوگئے، اور مغل حکمرانوں نے الگ الگ خود مختار ریاستیں بنالیں، اس طرح تیموری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، اس عظیم الشان سلطنت کا چراغ ٹمٹمارہا تھا کہ ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا ابن ابوسعید گورگان پیدا ہوا، بابر کی پیدائش کے وقت اس کا ایک چچا سلطان احمد مرزا سمرقند پر حکمراں تھا، بدخشاں، قندز، ترمذ، اور حصار پر سلطان محمود کی حکومت تھی، کابل اور غزنی پر الغ بیگ قابض تھا، تاشقند اور شاہ رخیہ پر بابر کے ماموں سلطان محمود خاں کا تسلط تھا، اور خراسان پر حسین مرزا کی فرماں روائی تھی، اور فرغانہ کی ولایت پر عمر شیخ مرزا بابر کا باپ حکمراں تھا۔ ۸۹۹ھ میں بابر تخت فرغانہ پر متمکن ہوا (۱) ریاست فرغانہ اس زمانہ میں ترکستان کی ایک چھوٹی مگر خوش حال ریاست تھی، جو دریائے سیحون کے دہانے پر دونوں کے کنارے پر واقع تھی، بابر کی کمسنی اور امراء و اقرباء کی ریشہ دوانیوں کے باعث اسے وہاں سے نکلنا پڑا، ان دنوں سمرقند شیبانی خان بن ابراہیم (جوجی بن چنگیز کی نسل سے تھا) (۲) کے زیر اقتدار تھا، ۹۰۹ھ میں اس سے بابر کی جنگ ہوئی تو اپنے مدمقابل کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر اس نے افغانستان کا رخ کرلیا، اس زمانے میں وہاں خاندان ارغون (ایلخانی) برسرعروج تھا، اس خاندان کے بانی ذوالنون بیگ نے جس کے ذمہ غور و سیستان کی ولایت تھی، ہزارہ اور نیکوداری قبائل کو رام کرنے کے بعد زابلستان اور گرم سیر کے علاقے بھی اپنے قبضہ و تصرف میں کرلئے اور قندھار کو دارالحکومت بنا کر خود مختار حکمراں بن گیا تھا اور اپنے لڑکے شاہ بیگ کی مدد سے جنوب کی طرف درۂ بولان اور سیستان تک کے علاقوں کو مطیع کرلیا، ۹۰۴ھ میں غور، زمینداور اور قندھار کے تاجیکوں اور افغانوں پر مشتمل لشکر ترتیب دے کر ہرات پر پیش قدمی کی، اور اس کے لڑکے مقیم نے امیر عبدالرزاق بن الغ بیگ کو کابل پر حملہ کر کے لغمان کی طرف ڈھکیل دیا (۳) (۹۰۸ھ)۔

(۱) ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد، سید صباح الدین عبدالرحمن ص ۱۲۶۔ (۲) ایضاً ص ۱۸۱۔ (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۴۔

تاہم کابل پر اس کا قبضہ نہایت مختصر تھا، بابر شمالی علاقوں سے اتر کر آیا اور اس کے دار الخلافہ کا محاصرہ کرلیا۔ ۹۱۰ھ/مطابق ۱۵۰۴ء میں بابر نے کابل وغزنہ پر قبضہ کرلیا، اور مقیم مقابلے کی تاب نہ لاکر قندھار واپس چلا گیا(۱) ان ہی دنوں شیبانی خان نے ذوالنون بیگ پر حملہ کردیا اور ازبکوں کے خلاف پہلی ہی لڑائی میں ذوالنون مارا گیا، ۹۱۳ھ میں شیبانی نے ہرات پر قبضہ کرلیا اب شاہ بیگ اور مقیم (ذوالنون کے دونوں بیٹے) بابر اور شیبانی خان جیسے اولوالعزم طاقتور شخصوں کے درمیان تھے، ایک طرف بابر جو تیموری سلطنت کا اصلی وارث تھا دوسری طرف شیبانی خان جس کا ستارۂ اقبال بام عروج پر تھا، بالآخر ارغوانی امراء شیبانی سے مل گئے اور برادرانِ ارغوان سے بابر کا جو معاہدہ (۲) ہوا تھا اس کا پاس انہوں نے نہ کیا، اس پر بابر کو نہایت سخت غصہ آیا اور اس نے حملہ کی تیاری شروع کردی، اور انہیں شکست دے کر قندھار لے لیا، اور اس پر اپنے بھائی ناصر مرزا کو والی مقرر کرکے ہرات اس مقصد سے چلا گیا کہ سلطان حسین سے مل کر ازبکوں کے مقابلے کی دفاعی تدابیر پر غور کرے، اسے راستے میں سلطان کی خبر مرگ مل گئی تاہم اس کے لڑکوں کی مرغاب پر صف آرائی میں شریک رہا اور وہاں سے ہرات کا قصد کرلیا، موسم سرما میں کوہستانی راستوں سے کابل آیا جس کے سبب اس کی فوج کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ۹۱۲ھ میں جب وہ کابل پہنچا تو اس کے اعزہ اس کے خلاف سازش میں مصروف تھے، اس نے کابل پہنچتے ہی سازش کا قلعہ قمع کیا، اس کے بعد موسم گرما میں قندھار کی مہم پر گیا، پھر ہندوستان پر پیش قدمی کی تیاری بلکہ کوچ کرچکا تھا کہ اطلاع ملی کہ شیبانی نے قندھار فتح کرکے وہاں ارغونیوں کے اثر ونفوذ کو بحال کردیا، بابر جگدلک اور ننگرہار کے افغان قبائل سے پہلے ہی سے برسرپیکار تھا، اس وقت شیبانی خان کی قوت اور توسیع سلطنت کی آرزو بابر کے لئے سوالیہ نشان بن گئی، چنانچہ اس نے اپنے احباب اور فوجی سرداروں کی ایک کونسل منعقد کی کہ ان ہنگامی حالات سے کیسے

(۱) تزک بابری ص ۸۷ (اردو ترجمہ)۔ (۲) جس وقت یہ ازبک سردار خراسان پر تاخت کررہے تھے، ارغوانیوں اور بابر کے مابین دوستی ووفاداری کا معاہدہ ہوا تھا۔

نپٹا جائے، سب کا متفقہ یہ فیصلہ تھا کہ شیبانی کا مقابلہ کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے ہمیں کابل کی فکر اپنے دل ودماغ سے نکال دینی چاہئے اور یا تو ہم بدخشاں کی طرف کوچ کریں یا ہندوستان کا رخ کریں، (۱) بابر کی عدم مزاحمت کے باعث شیبانی خراسان کا مالک اور قندھار کا بالادست حکمراں بن بیٹھا، تاہم کوہستان غور کی ایک مہم میں شدید نقصان اٹھانے کی وجہ سے اس کی طاقت رو بہ زوال تھی، اس کے علاوہ سلطنت صفویہ کا بانی شاہ اسمٰعیل صفوی نے ۹۱۶ھ میں خراسان پر لشکر کشی کردی، لشکر کشی کی وجہ یہ تھی کہ جب شیبانی سلطان حسین مرزا بیقرا کے خاندان کو خراسان کے نواح میں پیہم شکستیں دے رہا تھا تو اس کی فوجیں فتوحات کے نشہ میں سرشار شاہ اسمٰعیل کے حدود مملکت میں داخل ہوکر قتل وغارت گری میں مصروف اور کرمان کے صوبہ کو تاخت وتاراج کررہی تھیں، چنانچہ اس نے انتقام کے لئے شاہ اسمٰعیل نے اپنی فوجوں کو ترتیب دیا اور شمال میں مرو کی جانب اپنے حریف کو ڈھکیل دیا، مرو سے دس بارہ میل دور شاہ اسمٰعیل کی سترہ ہزار جنگ آزمودہ سوار فوج نے ازبک شیبانی پر حملہ کردیا اور نہایت سخت مزاحمت کے بعد اس کی فوج کو شکست دی، اس معرکہ میں شیبانی جس نے نسل تیموری کے ایک ایک چراغ کو گل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا کام آگیا (۲) اور ہرات پر شاہ اسمٰعیل کا قبضہ ہوگیا اور شیعہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنا مذہب وہاں جبراً رائج کیا، بابر نے شاہ اسمٰعیل سے مل کر کچھ عرصہ کے لئے وسط ایشیا میں اپنی موروثی سلطنت بحال کرلی، اور کابل کی مملکت اپنے بھائی ناصر مرزا کے حوالے کردی تاہم یہ متحدہ محاذ عوام الناس کو ناگوار تھا، ازبک دوبارہ اکٹھا ہوئے اور ۹۱۸ھ میں بخارا کے قریب بابر نے غجدوان میں شکست کھائی اور بڑی مشکل سے کابل کی طرف روانہ ہوا، جہاں سخت بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، یہاں اس نے اپنی مغل فوج نیز افغان قبائل کی شورشیں فرو کیں، یوسف زئی قبائل پشاور کی وادی میں گھس کر اپنے پیش رو دلازاکوں کو باجوڑ اور سوات کے پہاڑوں سے نقل مکانی پر مجبور کردیا تھا، بابر نے ان کی سرکوبی کرکے بڑی مشکل سے باجوڑ پر

(۱) بابر اور ان کا عہد ص ۳۱۶ وظہیر الدین محمد بابر ایل ایف رش بروک ولیمز ص ۱۲۰ ومابعد (اردو ترجمہ) (۲) بابر اور ان کا عہد ص ۳۲۳ ومابعد وسولہویں صدی کا معمار سلطنت ظہیر الدین محمد بابر ص ۱۳۰ ومابعد۔

قبضہ کیا اور ہزارا قبائل کی بغاوتیں بھی فرو کی، پھر قندھار جہاں پر اس وقت شاہ بیگ ارغون حکمراں تھا کی طرف توجہ کی، اسے ہرات میں قید کرلیا گیا، تاہم وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور سندھ میں اپنی بادشاہت کے قیام کا خواب دیکھنے لگا، اور ۹۱۷ھ میں بعض بلوچی قبائل کی مدد سے اس نے سندھ پر چڑھائی کی، دومرتبہ قندھار کی مہم میں ناکامی کے بعد بابر نے ۹۲۱ھ میں اسے فتح کیا، اس فتح نے بابر کے حوصلے بلند کئے اور اس نے ہندوستان کے لودھی افغانوں کی سلطنت کی طرف اپنی عنان توجہ منعطف کی، اور اپنا مستقر ہندوستان کو بنا کر افغانستان، کابل، بدخشاں اور قندھار تک کے علاقوں کا حکمراں بن گیا، تاہم کابل کو ہندوستان کے میدانوں پر ہمیشہ ترجیح دی اور وصیت کی کہ اس کو کابل میں دفن کیا جائے، (۱)۔

سولہویں صدی عیسوی میں افغانستان، ہندوستان اور ایران کی دوعظیم الشان سلطنتوں کے زیر اثر منقسم اور پرامن دور میں داخل ہوچکا تھا، ہرات اور سیستان کی ولایتیں ایران کے تصرف میں رہیں، گو ازبکوں کی ریشہ دوانیاں اور حملے اس کے اطمینان وسکون میں خلل انداز رہیں، تاہم کابل سلطنت مغلیہ کا حصہ بنا رہا، اور قندھار کے علاقے پر کبھی مغل اور کبھی ایرانیوں کا قبضہ ہوجاتا تھا، مغل اقتدار کا دائرہ کوہستان ہندوکش کے جنوب تک محدود تھا، شمال میں سلیمان مرزا جسے بابر نے بدخشاں کا والی بنایا تھا، کی حکومت تھی، اور ملک کے بقیہ اقطاع شیبانیوں کے زیر نگیں تھے۔

بابر کے بعد ہمایوں کی تخت نشینی کے وقت اس کے بھائی کامران، ہندال اور عسکری، مختلف ولایتوں کے والی تھے، کابل وقندھار مع پنجاب کے کامران کے قبضے میں تھا (۲) اور صفوی حاکم طہماسپ نے ہرات کی ولایت سام مرزا کے سپرد کی تھی، صفوی حکمراں قندھار کو سلطنت خراسان کا باجگذار سمجھتے تھے اور اس پر مغل تیموریوں کے قبضے کو غاصبانہ خیال کرتے تھے، چنانچہ ۹۴۱ھ میں سام مرزا نے جب اچانک قندھار پر حملہ کیا تو کامران نے لاہور سے آکر سام مرزا کو شکست دی، اور خواجہ کلاں کے سپرد کرکے واپس چلا گیا، سام مرزا کی غیر حاضری میں عبید اللہ ازبک نے خراسان پر چڑھائی اور ہرات پھر تاراج ہوا، تو طہماسپ نے از سرنو

(۱) تفصیل کے دیکھئے بابر اوران کا عہد ص ۳۷۷ و مابعد وتزک بابری ص ۱۳۶ و مابعد واردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۵۔ (۲) تفصیل کے لئے دیکھئے صولت شیر شاہی ص ۶۱ و مابعد وتاریخ ہندوستان پانچواں حصہ، الفنسٹن ص ۳۹۷۔

اسے فتح کرکے سام مرزا کو معزول کردیا اور قندھار کو بھی اپنے تسلط میں کرلیا، چنانچہ ۹۴۳ھ میں کامران نے پھر قندھار فتح کیا، اسی دوران شیر شاہ سوری کے زیر قیادت افغانوں نے ہمایوں کے خلاف بغاوت کردی اور ہندوستان کی حکومت ہمایوں کے ہاتھ سے چلی گئی، ۹۵۰ھ میں وہ سندھ پہنچا، سندھ سے قندھار کے جنوبی صحرا سے ہوتا ہوا سیستان اور ایران گیا جہاں شاہ طہماسپ نے اس کا پرجوش استقبال کیا، اس زمانے میں بدخشاں سے قندھار اور کابل (دار السلطنت) سے وادی سندھ تک کامران کی حکومت تھی، ۹۵۱ھ میں شاہ طہماسپ سے تعاون حاصل کرکے ہرات کی راہ سے دریائے ہلمند کے کنارے پہنچا تو بست میں شاہم علی اور میر خلیج کا جو کامران کے مقرر کردہ والی تھے، محاصرہ کرلیا، پھر ۹۵۲ھ میں عسکری مرزا سے قندھار چھین کر صفوی معاہدہ کے مطابق شہزادہ مراد صفوی کے سپرد کردیا، پھر شہزادے کی وفات کے بعد قندھار پر خود حکمراں ہوگیا (۱) اور اسے بیرم خاں کے حوالے کرکے کابل پر حملہ کیا، اور رمضان ۹۵۲ھ میں کابل سر کیا، پھر وہاں سے بدخشاں کی تسخیر کے ارادے سے کوچ کیا اور سلیمان مرزا سے شکست کھا کر پسپا ہوگیا، کابل کو خالی پاکر کامران نے پھر کابل پر فوج کشی کی اور شہر پر قبضہ کرکے ہمایوں کی بیگمات اور شہزادہ اکبر کو قید کرلیا، (۲) بالآخر ۹۶۱ھ میں کامران نے ہمایوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تو ہمایوں قندھار اور کابل کا مالک بن گیا اور خود کو طاقت ور سمجھ کر ہندوستان کو دوبارہ مسخر کرنے کا عزم کیا، اور سور بادشاہوں کو مفتوح کرکے ۹۶۲ھ میں تخت دہلی پر متمکن ہوگیا، ہمایوں نے ۱۴/ ربیع الاول ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں دہلی میں وفات پائی (۳) اس کی وفات کے بعد اس کا لڑکا جلال الدین اکبر ۱۳/سال کی عمر میں باغ کلانور (پنجاب) میں تخت نشین ہوا، ابھی وہ تسخیر ہند کی مہم کی تکمیل میں مصروف تھا کہ طہماسپ نے قندھار پر قبضہ کرلیا، اس وقت سے یہ شہر ایرانیوں کے ہی قبضے میں رہا، یہاں تک کہ ۱۰۰۳ھ میں شہزادہ مظفر حسین نے اسے اکبر کے حوالے کیا اور شاہ بیگ کابلی قندھار کا حاکم مقرر ہوا۔

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۶۔ (۲) منتخب التواریخ ص ۳۰۰۔ (۳) تاریخ ہندوستان ص ۸۲۱ و اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۲۸۶۔

عہد اکبری میں افغانستان کے اہم واقعات اکبر کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی سلطان میرزا نے محمد حکیم بن ہمایوں کو کابل میں محصور کرلیا، ۰۷ھ۹ میں ابوالمعانی ترمذی نے دربار اکبری سے فرار ہوکر والدۂ محمد حکیم اور چند امراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو حکیم نے سلیمان میرزا سے مدد طلب کی جس نے ابوالمعالی کو غور بند کے پل پر قتل کر کے کابل پر قبضہ کرلیا اور حکومت محمد حکیم کے حوالہ کر کے بدخشاں واپس چلا گیا پھر بدخشانی امراء اور حکیم مرزا کی آپس میں ان بن ہوئی تو میرزا نے بدخشانی امیروں کو بے دخل کر دیا، پھر سلطان لشکر جرار لے کر کابل پر حملہ آور ہوا، چونکہ محمد حکیم مرزا میں مقابلہ کی تاب نہ تھی اس لئے وہ کابل چھوڑ کر جلال آباد چلا گیا (۱) بعد میں جب مرزا سلیمان کابل سے واپس ہوا تو حکیم مرزا نے کابل پر پوری طرح قبضہ کرلیا (۲) اس کے بعد اکبری دربار سے اعانت ملی تو کابل سے دریائے سندھ اور قندھار سے سلسلۂ ہندوکش تک کی مستقل حکومت اس کے ہاتھ آئی اور سلیمان کا نفوذ واثر ختم ہوگیا، کچھ عرصہ بعد حکیم نے لاہور پر دھاوا بول دیا تو اکبر نے ۹۷۴ھ میں اسے پشاور کی طرف پسپا کر دیا، ۹۸۷ھ میں محمد حکیم کی مدد سے سلیمان نے بدخشاں پر حملہ کیا تو شاہ رخ میرزا نے صلح کر کے طالقان سے ہندوکش تک کے علاقہ کو سلیمان کے حوالہ کردیا اور خود بدخشاں پر اکتفاء کیا (۳) ۹۸۹ھ میں محمد حکیم مرزا نے جب پھر ہندوستان پر حملہ کا عزم کیا تو اکبر پھر اسے شکست دے کر اس کے تعاقب میں کابل تک جا پہونچا، تاہم اسی سال کابل وزابلستان کا علاقہ اس کو دے کر ہندوستان واپس چلا آیا۔ ادھر سلیمان مرزا اور شاہ رخ کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر حاکم بلخ عبداللہ خان ازبک نے دونوں کو کابل جانے پر مجبور کردیا ۹۹۳ھ میں جب حکیم مرزا کی وفات کے بعد اکبر نے مان سنگھ کو کابل کی حفاظت کے لئے روانہ کیا اور زین خاں کوکہ کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اس طرح کابل کا علاقہ اکبر کی سلطنت کا حصہ ہوگیا۔ (۹۹۵ھ) پھر اکبر کی فوجیں سوات اور باجوڑ کے علاقوں میں پشتونوں سے صف آراء ہوئیں ۹۹۷ھ میں ایک ماہ تک اکبر نے کابل میں اقامت اختیار کی اور قاسم خاں کابلی کو وہاں کی حکومت سپرد کی ان محاربات میں روشانی جلال الدین بن بایزید کے مقابلہ میں اکبر کی فوجوں

(۱) منتخب التواریخ ج۲ ص ۳۶۱ (۲) ایضاً ص ۳۷۰ (۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۷۔

کو کافی نقصان پہونچا اور اسکے نورتنوں میں سے ایک انہیں معرکوں میں کام آیا۔ (۱) ۱۰۱۴ھ میں اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا تو ہرات کے صفوی حکمراں حسین خاں شاملو نے قندھار پر چڑھائی کر دی اس کا مقابلہ شاہ بیگ حاکم قندھار نے ڈٹ کر کیا اور اس کی فوجیں بے نیل مرام واپس ہوگئیں اب جہانگیر نے قندھار، سندھ اور ملتان کی حکومت غازی خاں کے سپرد کر دی مآثر الامراء کے بیان کے مطابق جہانگیر نے ۱۰۱۶ھ میں شاہ بیگ کو پنج ہزاری منصب خان دوراں کا خطاب، کابل کی صوبیداری اور افغانستان کا نظم ونسق سپرد کیا (۲) لیکن ۱۰۲۰ھ میں احداد روشانی نے کابل پر تاخت کیا تو اس کی مدافعت اور کابل پر حکومت کے لئے جہانگیر نے قلیج خاں کو منتخب کیا۔ (۳) ۱۰۳۱ھ میں عباس صفوی کے دوبارہ قندھار پر حملے کے بعد جہانگیر کو اس پر فوج کشی کی مہلت نصیب نہیں ہوئی۔

۱۰۳۷ھ میں جہانگیر کی وفات کے بعد شاہ جہاں کو تخت نشینی ملی، تو تیراہ، پشاور، کابل اور بنگش کے علاقے جنگ وجدل کے آماجگاہ بنے رہے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حاکم بلخ نذر محمد خاں نے شمالی افغانستان کے علاقوں کو رام کر کے کابل کا محاصرہ کرلیا، اور تین ماہ کی معرکہ آرائی کے بعد شاہی افواج نے کابل پہنچ کر اسے پسپا کیا۔ (۴)

اسی سال افغانی قبائل نے متحد ہوکر بغاوت کر دی اور پشاور کا محاصرہ کرلیا، تاہم حاکم کابل سعید خاں نے انہیں مار بھگایا ۱۰۴۷ھ میں شاہجہاں نے قندھار پر لشکر کشی کا حکم دیا تو علی مراد خاں نے شہر حوالہ کر دیا پھر گرشک اور زمینداور پر بھی مغلوں کا قبضہ ہوگیا ۱۰۴۹ھ میں شاہجہاں نے کابل کا رخت سفر باندھا اور وہاں یوسف زئی قبیلوں کی شورشیں فرو کرنے کے لئے سعید خاں کو مامور کیا (۵) اس کے بعد ہندوکش سے قندھار تک کا علاقہ سلطنت دہلی سے ملحق کر دیا گیا، ۱۰۵۶ھ میں شاہ جہاں نے شمالی افغانستان کو سر کرنے کا عزم کیا اور بدخشاں سے بلخ تک

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے منتخب التواریخ ص ۵۲۵ و اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۷ (۲) مآثر الامراء ج ۲ ص ۶۴۳، ۶۴۴ (اردو ترجمہ) مرکزی اردو بورڈ، لاہور (۳) توزک جہانگیری ج ۱ ص ۳۳۶ (۴) مآثر الامراء ج ۳ ص ۱۴۳ (اردو ترجمہ) و شاہجہاں نامہ ج ۱ ص ۲۷۰ و مابعد (۵) ایضاً ج ۲ ص ۲۵۲ و مابعد

کے علاقے کو زیر کر کے اپنے حدود سلطنت دریائے آمو تک وسیع کر لئے لیکن ۱۰۵۸ھ میں شاہ عباس کی قندھار پر فتح کے بعد یہ شہر پھر کبھی عہد مغلیہ کا مقبوضہ نہ بن سکا حالانکہ شاہ جہاں نے متعدد بار اس کو فتح کرنے کی کوشش کی اورنگ زیب (۱) اور دارا شکوہ کی کوششیں بھی بارآور نہیں ہوئیں اور شاہجہاں صرف کابل و غزنہ ہی پر قابض رہا شمالی ولایات (میمنہ، اندخود، بلخ، طخارستان اور ہندوکش) ۱۰۵۷ھ سے تورانیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور سیستان اور ہرات صفویوں کے زیر تسلط آچکے تھے (۲) شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کو افغانستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ پر شورش دور کہا جا سکتا ہے، ۱۰۶۸ھ میں تخت نشینی کے بعد انہیں اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کے ساتھ بیرونی فتنہ انگیزیوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا چنانچہ ۱۰۷۷ھ میں یوسف زئی افغانوں کی جنہوں نے ملا چاک اور محمود خاں جدون وغیرہ کے زیر قیادت پکھلی پر تاخت کی اور امیر خان صوبہ دار کابل کو لکھا کہ شمشیر خاں کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ان کی فتنہ پردازیوں کی سرکوبی کے لئے مقرر کرے (۳) اسکے بعد ۱۰۷۹ھ میں خوش حال خاں مشہور جنگ جو شاعر سے نبرد آزما ہوا یہاں تک کہ اورنگ زیبؒ نے خود کمان سنبھالی اور افغانوں پر فتح پائی؛ اس مہم کو سر کرنے میں تقریباً تین سال صرف ہوئے (۴) عالم گیر کی وفات کے بعد شہزاد معظم کے زمانہ ہی سے دہلی کی تیموری سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور اس دور میں کابل و پشاور پر ناصر خاں حکمراں تھا اور غزنہ باقر خاں کے تحت تھا، قندھار میں ہوتکیوں کا بول بالا تھا، ہوتکیوں کا دائرہ تسلط پشین، مستونگ اور ڈیرہ جات تک دراز تھا، یہاں تک کہ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں نادر شاہ افشار کے ہاتھوں آل بابر کی تقریباً ڈھائی صدی کی حکومت تاراج ہوگئی، چونکہ یہ طویل زمانہ افغانوں کی شورشوں اور آپسی خونریزیوں میں ضائع ہوا اس لئے ہندوستان کے تیموری فرمارواؤں کی تہذیب و ثقافت کے

(۱) مگر سید صباح الدین عبد الرحمان کا بیان ہے کہ ۱۰۵۹ھ میں قندھار کی تسخیر شاہ جہاں نے اورنگ زیب کے ذمہ کی تھی بدخشاں، بلخ اور قندھار میں اسے کامیابی ملی اور ہندوستان کے دارالسلطنت میں تین دن تک شادیانے بجائے گئے تاہم شاہجہانی عہد میں ہی یہ علاقے ہندوستان سے کٹ بھی گئے، دیکھئے ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام ص ۱۰۵) (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۹ (۳) مآثر عالمگیری ص ۶۱ و اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۸۸ و تاریخ ہندوستان حصہ ۷ ص ۲۷۸ و مابعد (۴) مختصر تاریخ ہند (اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا) اردو ترجمہ ص ۲۹۴۔

اثرات افغانستان پر بہت زیادہ مترتب نہیں ہوئے، اس دور میں افغانستان کا علاقہ تین عظیم الشان حکومتوں کی سیاسی و تہذیبی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا، مغل حکومت کابل، غزنہ، قندھار پر قابض تھی، صفویوں نے ھرات کے وسیع علاقے اور قندھار پر اپنا آبائی حق سمجھ کر اس پر غیر کے تسلط کو کبھی برداشت نہیں کیا اور بلخ و بدخشاں میں تورانی سلطنت کے شادیانے بج رہے تھے۔

اس سہ طرفہ دباؤ کے ماحول میں افغانوں یعنی پشتونوں کے اندر قوت دفاع اور جذبہ خودمختاری نے کروٹ لی چنانچہ مغربی افغانوں نے ۱۱۳۴ھ میں اصفہان کو فتح کر لیا لیکن قلت تعداد کے باعث ایرانیوں کو ان کے عہدوں پر برقرار رہنے دیا۔ البتہ ان کے ساتھ ایک ایک افغان بھی شریک کر دئے تاہم بعد میں نادر شاہ کی درشت مزاجی کے سبب ۱۱۳۷ھ میں ایرانیوں نے اس کو قتل کر ڈالا (۱) اس زمانہ میں ہندوستان، ایران اور سلطنت عثمانیہ کے سیاسی و تجارتی تعلقات یورپی ممالک مثلاً انگلستان، ہالینڈ، فرانس اور ہسپانیہ وغیرہ سے استوار ہو چکے تھے اور ہندوستان (جس کی سلطنت کے ڈانڈے کابل، بخارا، پشاور وغیرہ سے ملے ہوئے تھے) کے تجارتی سامانوں کی آمد و رفت بیرونی ممالک سے یا تو پشاور، کابل اور بخارا کے خشکی کے راستے یا قندھار اور مشہد کی راہ سے ہوتی تھی، اس کی وجہ سے افغانستان میں صنعت و تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا چونکہ کابل، قندھار اور ھرات کے راستے سے تجارتی قافلے گذرتے تھے اس لئے افغانوں کے قبائل کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا اور ان کے اثرات بھی بڑھتے گئے غالباً اسی زمانہ میں ابدالی اور غلزئی قبائل پہاڑوں سے نکل کر قندھا، رزمین دوار، ترنگ اور ارغنداب کی لالہ زار اور سرسبز وادیوں میں پھیل گئے، کوہستان غور کی پہاڑیوں پر جب ہزارہ قابض ہو گئے تو افغانوں کو مزید ابھرنے کا موقع ملا چنانچہ افغان قوم مشرقی کوہستانوں پر حملہ آوروں کی زد سے بہت حد تک محفوظ رہی کیونکہ حملہ آوروں کے تگ و تاز کا اصل مقصد ہندوستان پر کوہستانی دروں کے راستے سے حملے کر کے اس کی دولت لوٹنا تھا، جوابی کاروائی کے وقت یہی درے ان

(۱) تاریخ ہندوستان جلد ۹ ص ۲۴۸

کی پناہ گاہ ہوتے تھے مختصر یہ کہ ان کوہستانی (افغانی) قبائل نے تمام حکومتوں کے مقابلہ میں اپنی آزادی برقرار رکھی۔ جن میں توخی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

توخیوں کا زمانہ توخی غلزئیوں کی ایک شاخ تھی جس نے تیموریان دہلی اور صفویان ایران کے درمیانی علاقوں میں اپنی خودمختاری برقرار رکھی، یہ ارغنداب اور ترنگ کا علاقہ تھا توخیوں میں شاہ محمد قلاتی بیرم خاں کے ملازمین میں تھا وہ اپنی فراست اور بیرم خاں سے خلوص وعقیدت کی بنا پر اس کا خاص معتمد ہوگیا تھا، ہمایوں کے زمانہ (۱۵۵۴ء/۹۶۲ھ) میں بیرم خاں نے شاہ محمد کو قندھار کی ولایت سپرد کردی۔ تو اس نے وہاں کے نظم مملکت کو بحسن وخوبی انجام دیا (۱) اسی کی نسل سے ایک فرد ملنخی تھا جسے اورنگ زیبؒ نے سلطان کا لقب دیکر قبائل غلزئی کا سردار تسلیم کیا تھا، اس کے زمانہ میں صفویوں، ہزاریوں اور غلزئیوں میں خوب لڑائیاں ہوئیں تو ملنخی اور ابدالی سردار خداداد خاں کے درمیان معاہدہ ہوا جس کے مطابق وادیٔ گرداب حد فاصل قرار پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے کے حاجی عادل، اس کے بعد اس کے لڑکے بائی خاں نے قلات اور اس کے اطراف پر حکمرانی کی، ملنخی کے لڑکوں کے بعد کچھ عرصہ اس کے برادر زادوں میں حکومت رہی اور اس خاندان کے لوگ امیر عبدالرحمٰن خان کے عہد تک اقتدار میں تھے۔

ابدالیوں کا عہد مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابدالیوں میں ابدال یا اودل کے نام سے جو شخص تاریخ اسلام میں مشہور ہے وہ ترین بن سرخبون بن سڑبن کا بیٹا تھا۔ اس کی ابتدائی تاریخ سے قطع نظر کرکے اس خاندان یا نسلن ے بعد کی صدیوں میں اہم اور جو قابل ذکر کارنامے انجام دئے۔ ان کو اختصار سے قلم بند کریں گے۔ کیونکہ افغانستان کی تاریخ سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

ابدالیوں کی نسل میں ملک صالح بن معروف بن بہلول لائق سردار گذرے ہیں۔ ملک صالح کا بھائی ملک سدو حکومت قندھار کا وارث ہوا اور یہی شخص سدوزئی قبیلہ کا جد اعلی ہے، اس

(۱) مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۸۵ (اردو ترجمہ) لاہور

سلطنت کو شاہ عباس صفوی نے بھی رسمی طور پر مان لیا تھا۔ پچھتر سال حکومت کرنے کے بعد اس نے اپنے لڑکے خضر خاں کو ولایت قندھار کا حکمراں بنایا۔ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں شاہ جہاں نے خضر خاں اور اس کے بھائیوں مغدود، زعفران خاں اور کامران و بہادر خاں کے خاص تعاون سے قندھار کو مسخر کیا تھا۔ (۱) اپنی خدمات کے صلہ میں مغدود اور کامران عنایات شاہی سے سرفراز ہوئے، ابدالی قبائل کا ایک فرد شیر خاں تھا اس نے حاکم قندھار مردان خاں زیک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور صفوی افواج کو شکست دی (۲) شیر خاں کے بعد سرمست خان اُس کے بعد دولت خان کو قندھار کی امارت ملی، دولت خاں ایک باہمت اور جنگجو شخص تھا۔ اس نے شاہ جہاں اور عالمگیر کے متعدد حملوں کا بڑا کامیاب دفاع کیا۔ دولت خاں کے بعد اسکا لڑکا رستم خاں جانشین ہوا اور بلوچوں کی مدد سے صفویوں کو شکست دی، صفویوں سے جنگ کے چار سال بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ابدالیوں کا زبردست اور ناقابل تلافی نقصان ہوا، ان کی متحدہ طاقت بکھر گئی اور قندھاری قبائل کی امارت حاجی میرویس کے ہاتھ آئی اس کے بعد ابدالی سردار ہرات جا کر قیام سلطنت کی کوشش میں مصروف ہوگئے چنانچہ حیات سلطان کے بیٹے عبداللہ خاں نے ۱۱۲۹ھ میں ہرات اور اس کے ملحقات پر قبضہ کرلیا۔ پھر اپنے بیٹے کی موت کے بعد حیات سلطان نے ہرات کی حکومت زمان خاں کے حوالہ کردی اور ابدالیوں نے اس کی قیادت میں صفویوں کا مقابلہ کیا اس کے بعد مہر خاں ولد عبداللہ خاں نے حکومت ہرات سنبھالی۔ کچھ دنوں بعد ابدالیوں نے ہوتکی امیر ذوالفقار خاں کو اپنا قائد منتخب کیا۔ اور اللہ یار خاں اور ذوالفقار خاں نے مل کر نادر شاہ افشار سے سخت مقابلہ کیا اور اس کی پیش قدمی میں حائل ہوکر دو ماہ کی لڑائی کے بعد نادر شاہ سے ہرات پر اپنا تسلط تسلیم کرالیا (۲) مگر بعد میں نادر شاہ نے ہرات پر قبضہ کرلیا۔

ہوتکیوں کا دور زمین دار کے اطراف وجوانب میں آباد افغانوں کی ایک قوم غلزئی ہے غلزئی ہاتکی سلطنت کے بانی میرویس کا مورث اعلی ہے میرویس سلطان ملنخی کا نواسہ اور ابدالی امیر

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں تاریخ ہندوستان جلد ۷ ص ۲۵۱ و مابعد (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۹۲

کامران خاں کا داماد تھا، اپنی خوش خلقی اور خاندانی وجاہت کے باعث افغانوں کے ہوتکی، غلزئی اور ابدالی قبائل کی حمایت حاصل کر کے قندہار میں اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، سلطان حسین (ایرانی حکمراں) کے زمانہ میں جب گرگین خاں کو قندہار کی ولایت ملی تو اس نے افغانوں پر بڑے مظالم کئے چنانچہ میرویس نے صفوی حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا تاہم مایوسی ہوئی۔ اس نے وہیں سے مکہ کا عزم کیا واپسی پر اس نے اپنی قوم کو اکٹھا کر کے اہل قندھار کی مدد سے گرگین خاں پر حملہ کر دیا، اور صفوی سلطنت کا خاتمہ کر کے قندہار کا حکمراں بن بیٹھا۔ صفویوں نے اس کو رام کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنی گردن طوق غلامی میں دینا منظور نہیں کیا۔ ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۲ء میں حاکم ایران نے کیخسرو کو تسخیر قندھار پر مامور کیا۔ لیکن وہ اپنی بدتدبیری کے سبب مارا گیا۔ اس کے بعد محمد زمان خاں شاملو اس مہم پر مامور ہوا تو وہ راستے ہی میں وہاں پہونچنے سے پہلے مرگیا (۱) میرویس کے قبضہ میں قندھار کا پورا علاقہ مغرب میں فراہ وسیستان اور مشرق میں پشین غزنہ تک تھا۔

میرویس کی وفات کے بعد اس کے بھائی عبدالعزیز نے ایران کی اطاعت قبول کی تو میرویس کے بیٹے نے اس کو قتل کر کے ۱۱۲۹ھ میں خود مسندِ اقتدار کو زینت بخشی۔ ۱۱۳۴ھ میں اصفہان پر لشکر کشی کر کے شاہ حسین کے نفوذ واثر کو نابود کر دیا۔ اس کے بعد شاہ اشرف بن عبدالعزیز تخت سلطنت پر متمکن ہوا اس کے زمانہ میں والی بغداد نے ایران پر متعدد حملے کئے تاہم ہر بار ناکام رہا۔ بعد میں صلح ہوگئی اور افغانوں اور عثمانیوں میں بہتر روابط قائم ہوئے۔ اشرف نے ایران کی شمالی سرحدوں پر روسی فوجوں کا مقابلہ کیا تاہم پانچ سال بعد نادر شاہ کے حملوں کی تاب نہ لاکر افغانستان کی طرف رخ کر لیا۔

۱۱۳۵ھ میں ہوتکی امیر شاہ محمود نے اصفہان کو فتح کیا اور قندھار کی حکومت اپنے بھائی کو دیدی، اس کے عہد میں حدود سلطنت فراہ، ہرات سبزوار، غزنہ، گومل سے آگے شال، فشین اور ڈیرہ جات تک ہوگئے تھے اور ۱۱۴۹ھ تک اس نے حکومت کی (۲) تحریک آزادی کے لحاظ سے ہوتکی دور کافی اہم ہے۔ چنانچہ نادر شاہ نے جب ہرات میں ابدالیوں، ایران میں ہوتکیوں قندھار میں غلزئیوں کی بساط حکومت الٹی تو افغانوں میں تحریک قومیت اور آزادی کے جذبات بیدار ہو چکے تھے اور ان کے اندر قومی مملکت کے قیام کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے۔ (باقی)

(۱) مآثر الامراء ج ۳ ص ۵۸۰، ۵۸۱۔ (۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۹۹۳

''کلیات اقبال''

میں انبیاء اور صحابہؓ پر اشعار کے اشاریئے''

(حروف تہجی کے لحاظ سے)

از: جناب محمد بدیع الزماں صاحب☆

اقبال کا کلام قرآن کی تعبیر وتفسیر ہے، اقبال نے مسلمانوں کے مضمحل قوا میں جہاں قرآنی تعلیمات کو اپنے اشعار میں سمو کرنئی جان ڈالنے کی کوشش کی وہیں دینِ اسلام سے جڑے بہت سے نبیوں رسولوں، صحابہؓ اور صحابیہؓ کو بھی اپنے کلام میں خراج عقیدت پیش کیا اور مسلمانوں کو ان کی تعلیمات کی یاد دلائی۔

اس مضمون میں، اقبال کے کلام میں نبیوں (۱) رسولوں، صحابہؓ اور صحابیہؓ پر جتنے اشعار ہیں ان کے الگ الگ صرف اشاریئے، ناموں کے حروف تہجی کے لحاظ سے دیئے جارہے ہیں اور آخر میں الگ الگ دونوں کا گوشوارہ دیا جارہا ہے ان گوشواروں کے لحاظ سے ''کلیات اقبال'' میں گیارہ نبیوں اور رسولوں پر ۱۶۸ اشعار ہیں اور گیارہ صحابہؓ پر ۵۰ اور ایک صحابیہؓ پر ایک شعر یعنی ۵۱ اشعار ہیں اس طرح کلیات اقبال میں نبیوں، اور رسولوں اور صحابہؓ اور صحابیہؓ پر کل ۲۱۹ اشعار ہیں۔

(۱) نبیوں اور اور رسولوں پر اشعار کے اشاریئے

حضرت ابراہیمؑ : حضرت ابراہیمؑ کے نام سے اقبال نے تین اصطلاحیں وضع کی ہیں:

☆ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ ہارون نگر فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف، پٹنہ۔

(۱) مقالہ نگار نے حضرت آدمؑ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ابراہیمؑ، براہیمؑ اور براہیمی۔ "ابراہیمؑ" کی اصطلاح سے چار اشعار ہیں جن میں سے تین "بانگ درا" کی نظمیں سوامی رام تیرتھ، نانک اور خضر راہ کی ذیلی نظم "شاعر" کے دوسرے بند میں ہیں اور ایک شعر "ضرب کلیم" کی نظم "علم اور دین" میں ہے۔

"براہیمؑ" کی اصطلاح سے بھی چار اشعار ہیں جن میں دو بانگ درا، کی نظم "جواب شکوہ" کے ساتویں اور پچیسویں بند میں ہیں اور ایک ایک "ضربِ کلیم" کی نظموں "**لااله الا الله**" اور "ایک فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام" میں ہے

"براہیمی" کی اصطلاح سے کل دو اشعار ہیں جو دونوں "بانگ درا" کی نظم "طلوع اسلامؑ" کے تیسرے اور پانچویں بند میں ہیں

حضرت ابراہیمؑ کو خلیل "اور خلیل اللہ" کے القاب سے اس لئے نوازا گیا ہے کہ خدا کا خود ارشاد ہے "اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا **واتخذالله ابراهيم خليلا** (النساء، ۱۲۵) اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کے ان القاب سے تین اصطلاحیں وضع کی ہیں: خلیل، خلیل اللہ اور خلیلاں۔

"خلیل" کی اصطلاح سے کلام میں کل اگیارہ اشعار ہیں جن میں چھ "بانگ درا" کی نظمیں "شاعر" بعد از نظم "قرب سلطان"، "کفر و اسلام"، میں اور تو (بعد از نظم شیکسپیر) "خضر راہ" کی ذیلی نظمیں "صحرانوردی" اور "دنیائے اسلام" اور "طلوع اسلام" کے آخری بند میں ہیں۔ باقی پانچ اشعار "بال جبریل" کی غزلیات ۴۲ اور ۴۸ اور نظمیں "مسجد قرطبہ" کے چوتھے بند اور "ذوق و شوق" کے دوسرے بند میں ہیں ایک شعر اس مجموعہ کی رباعی میں ہے۔

"خلیل اللہ" کی اصطلاح سے ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم طلوع اسلام کے

دوسرے بند میں ہے "خلیلاں" کی اصطلاح سے بھی ایک ہی شعر "بال جبریل" کی غزل ۵۲ میں ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیم کے نام اور القاب سے "کلیات اقبال" میں ۱۲۳ اشعار ہیں۔

(۲) حضرت اسماعیل علیہ السلام: حضرت اسماعیلؑ کے نام سے "کلیات اقبال" میں کل دو اشعار ہیں اور دونوں "بال جبریل" کی غزلیات میں ہیں، ایک شعر غزل ۱۰ (اول) میں ہے اور دوسرا غزل ۴۲ میں۔

(۳) حضرت الیاس علیہ السلام: اس سے ایک ہی شعر "بال جبریل" کی نظم "جبریل و ابلیس" میں ہے۔

(۴) حضرت خضر علیہ السلام: حضرت خضر علیہ السلام کا نام قرآن میں کہیں وارد نہیں، آپ کا ذکر صرف ایک بار نام نہ لے کر سورۃ الکہف کی آیت ۶۵ میں ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے کہا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ "جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا" اور جن کی ملاقات دریا کے کنارے حضرت موسیٰ سے ہوئی تھی، سورۃ الکہف میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے اسے (حضرت خضرؑ کو) ایک خاص علم عطا کیا تھا" حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰ کی ملاقات اور دونوں کے ساتھ سفر کی تفصیل سورۃ الکہف کے رکوع ۹ اور ۱۰ میں وارد ہے جسے "اقبال نے "بانگ درا" کی نظم "خضر راہ" کی ذیلی نظم "شاعر" کے درج ذیل دو مصروں میں سمو کر حضرت خضرؑ کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"کشتی مسکین" و "جانِ پاک" و "دیوار یتیم" علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

حضرت موسیٰ کی جس بندے سے ملاقات ہوئی تھی مفسرین کے بیان اور بعض روایات کے رو سے ان کا نام حضرت خضر تھا جس کی خود قرآن مجید میں کوئی تصریح نہیں ہے، بہرحال ان کے نام سے "کلیات اقبال" میں تیرہ اشعار ہیں جن میں آٹھ "بانگ درا" میں دو دو "بالِ جبریل" اور "ارمغان حجاز" میں اور ایک شعر "ضرب کلیم" میں ہے۔

"بانگ درا" کے آٹھ اشعار ان نظموں میں ہیں "عقل و دل"، "التجائے مسافر" پہلا

"کوشش ناتمام" "فلسفۂ غم" "آخری بند" "شفاخانہ حجاز" دوسرا بند "مسلمان اور تعلیم جدید"
"خضرراہ" شاعر پہلا بند اور اس نظم کی ذیلی نظم "سرمایہ و محنت"

"بال جبریل" کے دو اشعار میں ایک شعر اسی مجموعہ کی رباعی میں ہے اور دوسرا نظم "جبریل و ابلیس" میں۔ "ضرب کلیم" کا ایک شعر نظم "کافر و مومن" میں ہے۔

"ارمغان حجاز" کے دونوں اشعار نظم "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" میں ہیں۔

ایک اس نظم کے بارہویں بند میں ہے اور دوسرا پندرہویں بند میں "کلیات اقبال" میں حضرت خضرؑ کے نام سے ایک خصوصی نظم "خضرراہ" ہے جس میں ۱۸۵ اشعار ہیں۔

(۵) حضرت سلیمان علیہ السلام: اقبال کے کلام میں آپ کے نام سے تین اشعار ہیں جن میں دو بطور نام ہیں اور ایک بطور اصطلاح، یہ تینوں "بانگ درا" میں ہیں نام سے دو اشعار میں ایک شعر نظم "صبح کا ستارہ" کے پہلے بند میں ہے اور دوسرا نظم "شکوہ" کے ۲۷ویں بند میں ہے، اقبال نے "سلیمان" کو بطور اصطلاح نظم "تضمین بر شعر ابوطالب کلیم" میں استعمال کیا ہے۔

اقبال نے "سلیمان" سے دو اور اصطلاحیں وضع کی ہیں ایک "سلیمانے" اور دوسری "سلیمانی" جس سے کلام میں ایک ایک شعر ہے جن میں پہلا "بانگ درا" کی نظم خضرراہ کی ذیلی نظم "دنیائے اسلام" میں ہے اور دوسرا "ضرب کلیم" کی نظم "فقر و راہبی" میں ہے۔ اس طرح "سلیمان" سے "کلیات اقبال" میں پانچ اشعار ہیں۔

(۶) حضرت شعیب علیہ السلام: آپ کے نام سے کلام میں دو اشعار ہیں جو دونوں بطور اصطلاح استعمال کئے گئے ہیں ایک سطر "بال جبریل" کی ایک رباعی میں ہے اور دوسرا "ضرب کلیم" کی نظم "خودی کی تربیت" میں ہے۔

(۷) حضرت عیسیٰ علیہ السلام: آپ کے نام سے کل دو اشعار ہیں جن میں ایک "بانگ درا" کی نظم "شفاخانۂ حجاز" کے پہلے بند میں ہے اور دوسرا "بال جبریل" کی نظم "پیر و مرید" کے

پندرہویں سوال میں۔

(۸) حضرت مسیح ابن مریم علیہا السلام: آپ کے نام سے "کلیات" میں سات اشعار ہیں جن میں دو "بانگ درا" میں، ایک بال جبریل میں اور چار ارمغان حجاز میں ہیں "بانگ درا" کے دو اشعار میں ایک نظم "التجائے مسافر" کے پہلے بند میں ہے اور دوسرا نظم "محبت" میں "بال جبریل" کا ایک شعر غزل ۵۹ میں ہے "ارمغان حجاز" کے چار اشعار میں تین نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ہیں اور ایک "نظم مسعود مرحوم" میں۔

اقبال نے "مسیح" سے ایک اصطلاح "مسیحائی" بھی وضع کی ہے جس سے ایک ہی شعر ہے جو "بانگ درا" کی غزلیات حصہ سوئم کی چوتھی غزل میں ہے۔

اس طرح "مسیح" سے کل آٹھ اشعار ہیں۔

(۹) حضرت محمد مصطفی ﷺ: "کلیات اقبالؒ" میں صرف "محمد" سے اگیارہ اشعار ہیں، جن میں چار "بانگ درا" میں ہیں، پانچ "ضرب کلیم" میں اور ایک ایک شعر "بال جبریل" اور "ارمغانِ حجاز" میں ہے۔

"بانگ درا" کے چار اشعار میں تین نظم "جواب شکوہ" کے چودھویں، بتیسویں اور آخری بند میں ہیں اور ایک نظم "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" میں ہے۔

"ضرب کلیم" کے پانچ اشعار نظمیں "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" "اے روح محمد" "امرائے عرب سے" "اہل مصر سے" اور "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں ہیں۔ "بال جبریل" کا ایک شعر غزل ۲ (اول) میں ہے اور "ارمغان حجاز" کا ایک شعر نظم "حسین احمد" میں ہے۔

اقبال نے "محمد" سے ایک اصطلاح "محمدی ﷺ" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "ضرب کلیم" کی نظم "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" میں ہے۔

اقبال نے "مصطفیؐ" کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے جس سے کلام میں سات اشعار

ہیں ان میں "بانگ درا" میں دو "بال جبریل" میں تین اور "ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز" میں ایک ایک شعر ہے "بانگ درا" کے دو اشعار میں ایک نظم "بلاد اسلامیہ" کے آخری بند میں ہے اور دوسرا نظم "خضر راہ" کی ذیلی نظم "شاعر" کے آخری بند میں۔

"بال جبریل" کے تین اشعار میں ایک غزل تین (دوم) میں ہے دوسرا نظم "مسجد قرطبہ" کے دوسرے بند میں اور تیسرا نظم "ذوق وشوق" کے آخری بند میں۔

"ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز" کا ایک ایک شعر علی الترتیب نظم "اشاعتِ اسلام فرنگستان میں" اور نظم "حسین احمد" میں ہے۔

اقبال نے مصطفی ﷺ سے ایک اصطلاح "مصطفوی ﷺ" بھی وضع کی ہے جس سے کل چار اشعار ہیں جن میں تین "بانگ درا" میں اور ایک "ضرب کلیم" میں ہیں "بانگ درا" کے دو اشعار نظم "وطنیت" کے دوسرے بند میں ہیں اور ایک نظم "ارتقاء" میں "ضرب کلیم" کا ایک شعر نظم "امرائے عرب سے" میں ہے۔

اقبال نے رسول اللہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے آپ کو بہت سے القاب سے نوازا ہے جن میں کئی بطور اصطلاح استعمال کئے گئے ہیں اور کئی بطور تراکیب جن کی تعداد ۳۰ ہے اور اشعار کی تعداد ۳۷ ہے ان میں بانگ درا میں ۲۹ "بال جبریل" میں چھ اور ضرب کلیم اور "ارمغان حجاز" میں ایک ایک شعر ہے۔ ان القاب کے اشارئے درج ذیل ہیں جو "بانگ درا" میں ہیں۔

(۱) شہنشاہ معظم: بلاد اسلامیہ پانچواں بند (۲) میر حجاز ﷺ: ترانۂ ملی
(۳) رسول عربی ﷺ: "شکوہ" اکیسواں بند (۴) احمد ﷺ مرسل: "شکوہ" بیسواں بند اور جواب شکوہ، آٹھواں بند
(۵) صاحبِ یثرب ﷺ: تضمین بر شعر ابو طالب کلیم (۶) رسول ﷺ میں: "جنگ یرموک کا

ایک واقعہ" اور "صدیق ؓ" پہلا بند
(۷) شہ لولاک ﷺ: بلاد اسلامیہ چوتھا بند اور ایک شعر "بال جبریل" کی رباعی میں ہے
(۸) خواجہ بدر و حنین: "طلوع اسلام" آخری بند
(۹) کملی والے ﷺ: غزلیات حصہ سوئم۔ پہلی غزل
(۱۰) میر عرب ﷺ: ہندوستانی بچوں کا قومی گیت۔ تیسرا بند (۱۱) ختم رسل: "جواب شکوہ" پچیسواں بند (۱۲) پیغمبر ﷺ: "بلاد اسلامیہ" دوسرا بند
(۱۳) محبوب ﷺ: "شکوہ" تیسرا بند (۱۴) نبی ﷺ "قطعہ" (قبل نظم "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" تیرہواں بند اور بال جبریل کی نظم "پیر و مرید" کا پندرہواں سوال
(۱۵) رحمت ﷺ: حضور رسالت مآب ﷺ میں (۱۶) حضور: حضور رسالت مآب میں
(۱۷) رسول مختار ﷺ: "جواب شکوہ چودھواں بند۔
(۱۸) رسول ﷺ: "صدیق ؓ" دوسرا بند اور "جنگ یرموک کا ایک واقعہ"
(۱۹) رسول پاک ﷺ: "صدیق ؓ" پہلا بند
(۲۰) شہ یثرب "فردوس میں ایک مکالمہ"
(۲۱) حضور رسالت ﷺ پناہ: جنگ یرموک کا ایک واقعہ"
(۲۲) رسول ہاشمی ﷺ: "مذہب" (بعد از نظم جنگ یرموک کا ایک واقعہ"۔
(۲۳) سرور عالم ﷺ: "صدیق ؓ" پہلا بند (۲۴) نبوی ﷺ: "وطنیت" دوسرا بند
(۲۵) پیغمبر ﷺ: "جواب شکوہ" ساتواں بند یہ "بانگ درا" کا انتیسواں شعر ہے "پیغمبر" سے ایک شعر "ارمغان حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ میں" بھی ہے "بال جبریل" کے چھ اشعار یہ ہیں: (۲۶) دانائے سبل ختم رسل: غزل (۱) دوم مولائے کل (۲۷) مرد خلیق: غزل ۱۱ (دوم)
(۲۸) مولائے یثرب ﷺ: غزل ۱۴ (اول)

(۲۹) صاحب لولاک ﷺ غزل ۱۰ (دوم)

"بال جبریل" کے دو اشعار نمبر شمار ۷ اور ۱۴ میں آچکے ہیں "ضرب کلیم" کا ایک شعر یہ ہے۔ (۳۰) مازاغ: غزل بعد از نظم "اساتذہ"۔

"ارمغان حجاز" کا ایک شعر نمبر شمار ۲۵ میں آچکا ہے۔

اقبال نے رسول اللہ ﷺ پر دو نظمیں "حضور رسالت مآب میں اور اے روح محمد ﷺ بھی لکھی ہے جو دونوں "بانگ درا" میں ہیں۔ اس طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر "کلیات اقبال" میں ساٹھ اشعار ہیں۔

(۱۰) حضرت موسیٰ علیہ السلام: حضرت موسیٰ کے نام سے "کلیات اقبال" میں چھ اشعار ہیں جن میں پانچ "بانگ درا" میں ہیں اور ایک "ضرب کلیم" میں "بانگ درا" کے پانچ اشعار نظم "بلالؓ" (بعد از نظم چاند) "جواب شکوہ" بارہواں بند "خضر راہ" کی ذیلی نظمیں "شاعر" دوسرا بند اور "سلطنت" اور ایک شعر اس مجموعہ کی غزلیات حصہ اول کی دوسری غزل میں ہے چھٹا شعر "ضرب کلیم" کی غزل (بعد از نظم) "فقر و راہبی میں ہے۔

حضرت موسیٰ کو "کلیم" اور "کلیم اللہ" کے القاب سے اس لئے نوازا جاتا ہے کہ یہ خدا کا خود ارشاد ہے "ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔ (وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا نساء۔ ۴: ۱۶۴) جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہونچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا (وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ)۔ (الاعراف ۷: ۱۴۳)

"اے موسیٰ میں نے تمام لوگوں کو ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا ہے کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو (بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ)۔ (الاعراف ۱۴۴)

"ہم نے اس کو طور کے داہنی جانب سے پکارا اور راز کی گفتگو کی"۔ (مریم، ۵۲)

اقبال نے "کلیم" کو بطور اصطلاح بھی استعمال کیا ہے۔ اور اس سے تین دیگر

اصطلاحیں "کلیمی"، "کلیم اللّٰہی" اور "کلیمانہ" وضع کی ہے۔

"کلیات اقبال" میں "کلیم" کی اصطلاح سے ۲۹ اشعار ہیں جن میں "بانگ درا" میں سولہ "بال جبریل" میں نو "ضرب کلیم" میں تین اور "ارمغان حجاز" میں ایک شعر ہے "بانگ درا" کے سولہ اشعار میں بارہ اس مجموعہ کی نظموں میں ہے اور چار غزلیات میں۔ نظموں کے نام یہ ہیں (۱) ہمالہ پہلا بند (۲) "شمع و پروانہ" (۳) "درد عشق" دوسرا بند (۴) "نالۂ فراق" چوتھا بند (۵) "بلالؓ" (بعد از نظم "چاند") (۶) "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" آخری بند (۷) حسن وعشق" پہلا بند (۸) "شمع اور شاعر" (ذیلی نظم "شاعر") (۹) "شمع اور شاعر" (ذیلی نظم "شمع" ساتواں بند (۱۰) تضمین بر شعر ابو طالب کلیم (۱۱) "کفر و اسلام" اور (۱۲) "میں اور تو" (بعد از نظم "شیکسپیر)

دو اشعار غزلیات حصہ اول کے پانچویں اور آخری غزل میں ہیں اور ایک ایک شعر غزلیات حصہ دوم کی چھٹی اور حصہ سوئم کی چھٹی غزل میں ہے۔

"کلیم کی اصطلاح سے "بال جبریل" کے نو اشعار میں تین اس مجموعہ کی نظمیں "مسجد قرطبہ" چوتھا بند، "لالۂ صحرا" اور "ساقی نامہ" کے دوسرے بند میں۔ باقی چھ میں دو غزل ۱۶ (دوم) میں ہے۔ اور ایک غزل ۲۰۔ ۳۹۔ ۴۱۔ اور ۵۹ میں ہے۔

"ضرب کلیم" کے تین اشعار نظمیں "علم اور دین"، "فقر و ملوکیت" اور "اہل مصر سے" میں ہیں "ارمغان حجاز" کا ایک شعر اس مجموعہ کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ہے۔

"کلیمی" کی اصطلاح سے کل پانچ اشعار میں جن میں تین "بال جبریل" میں ہیں اور دو "ضرب کلیم" میں "بال جبریل" کے تین اشعار ہیں ایک غزل ۵۰ میں ہے اور دو دو رباعیوں میں "ضرب کلیم" کے دو اشعار میں ایک نظم "خودی کی تربیت" میں ہے اور دوسرا نظم "فنون لطیفہ" میں "کلیم اللّٰہی میں تین اشعار ہیں جن میں ایک "بال جبریل" میں ہے اور دو

ضرب کلیم میں ''بال جبریل'' کا شعر غزل ۵۷ میں ہے اور ''ضرب کلیم کے دو اشعار نظمیں ''رقص'' اور دو نفسیات غلامی'' میں ہیں۔

''کلیمانہ'' سے کل دو اشعار ہیں جن میں ایک ''بال جبریل'' کی غزل ۴۷ میں ہے اور ایک ''ارمغان حجاز'' کی نظم ''ملا زادہ ضیغم لولابی'' کشمیری کا بیاض کے اگیارہویں بند میں ہے۔

اقبال نے حضرت موسیٰ کے لئے ''صاحب سینا'' کا لقب بھی وضع کیا ہے جس سے ایک ہی شعر ''بانگ درا'' کی نظم ''کفر و اسلام'' میں ہے اس طرح حضرت موسیٰؑ پر کل ۴۶ اشعار ہیں۔

(۱۰) **حضرت نوح علیہ السلام:** اس نام کے ایک ہی شعر ''بانگ درا'' کی نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کے آخری بند میں ہے۔

(۱۱) **حضرت یوسف علیہ السلام:** کلیات اقبال میں حضرت یوسف سے پانچ اشعار ہیں جن میں دو نام سے ہیں اور باقی تین میں اقبال نے اس نام کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے یہ پانچوں اشعار بانگ درا میں ہیں۔

نام سے دو اشعار میں ایک شعر نظم ''رخصت اے بزم جہاں'' میں ہے اور دوسرا نظم ''تصویر درد'' کے پانچویں بند میں ہے۔

بطور اصطلاح تین اشعار میں ایک اصطلاح یوسف ثانی ہے جو نظم ''التجائے مسافر'' کے دوسرے بند میں ہے دوسری اصطلاح ''یوسف گم گشتہ'' ہے جو نظم ''عبد القادر کے نام میں ہے تیسری اصطلاح گرچہ نام سے ہے مگر اقبال نے اسے بمعنی مسلمان استعمال کیا ہے جو نظم جواب شکوہ کے اٹھائیسویں بند میں ہے۔

کلیات اقبال میں انبیائے کرام پر اشعار کا گوشوارہ

نمبر شمار	نبیوں اور رسولوں کے نام	تعداد اشعار	نمبر شمار	نبیوں اور رسولوں کے نام	تعداد اشعار
۱۔	حضرت ابراہیم علیہ السلام	۲۳	۲۔	حضرت اسماعیل علیہ السلام	۲
۳۔	حضرت الیاس علیہ السلام	۱	۴۔	حضرت خضر علیہ السلام	۱۳
۵۔	حضرت سلیمان علیہ السلام	۵	۶۔	حضرت شعیب علیہ السلام	۲
۷۔	حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۲	۸۔	حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام	۸
۹۔	حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ	۶۰	۱۰۔	حضرت موسیٰ علیہ السلام	۴۶
۱۱۔	حضرت نوح علیہ السلام	۱	۱۲۔	حضرت یوسف علیہ السلام	۵

میزان ۱۶۸

(۲) ''کلیات اقبال'' میں صحابہؓ کرام پر اشعار کے اشاریئے

(۱) **حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:** حضرت ابوبکرؓ کے نام سے ''کلیات میں صرف ایک ہی شعر ہے جو ''بانگ درا'' کی نظم ''خضر راہ'' کی ذیلی نظم ''دنیائے اسلام'' کے تیسرے بند میں ہے آپ کے لقب ''صدیق'' جو مکہ والوں نے آپ کو دے رکھا تھا۔ اقبال کی ''بانگ درا'' میں ایک نظم ''صدیقؓ'' ہے اس لقب سے تین اشعار ہیں جن میں دو اسی نظم ''صدیقؓ'' میں ہیں اور تیسرا شعر ''بال جبریل'' کی نظم ''ساقی نامہ'' کے تیسرے بند میں ہے۔ اقبال نے اس نظم ''صدیقؓ'' کے دوسرے بند میں آپ کو ''رفیق نبوت'' کے لقب سے بھی نوازا ہے۔ جس کا ذکر سورۃ التوبہ کی آیت ۴۰ میں وارد ہے۔

(۲) **حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ:** آپؓ کے نام سے ''کلیات میں صرف ایک ہی شعر ''بانگ درا'' کی نظم ''جنگ یرموک کا ایک واقعہ'' میں ہے

(۳) **حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ:** ''کلیات'' میں آپ کے نام سے

صرف ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم "بلاد اسلامیہ" کے چوتھے بند میں ہے۔

(۴) **حضرت بلال رضی اللہ عنہ:** آپ کے نام "کلیات" میں تین اشعار ہیں جو تینوں "بانگ درا" میں ہیں۔ پہلا شعر نظم "شکوہ" کے اکیسویں بند میں ہے، دوسرا اور تیسرا نظم "بلالؓ" (بعد از نظم "کفر و اسلام") میں ہے۔

اقبال نے آپؓ کے نام سے ایک اصطلاح "بلالی" بھی وضع کی جس سے دو اشعار ہیں جو دونوں "بانگ درا" کی نظم "جواب شکوہ" کے سولھویں اور ۳۵ ویں بند میں ہے۔

اقبال نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ پر ہی خصوصی نظمیں لکھی ہیں اول الذکر پر نظم "صدیقؓ" ہے اور موخر الذکر پر دو نظمیں ہیں جن میں ایک نظم "چاند" کے بعد ہے اور دوسری نظم "کفر و اسلام" کے بعد ہے یہ تینوں نظمیں "بانگ درا" میں ہیں۔

(۵) **حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ:** "کلیات" میں آپؓ پر کل دو اشعار ہیں ایک شعر "بانگ درا" کی نظم "طلوع اسلام" کے چوتھے بند میں ہے اور دوسرا "بال جبریل" کی غزل (دوم) میں۔

(۶) **حضرت حسین رضی اللہ عنہ:** "کلیات" میں آپؓ کے نام سے تین اشعار ہیں تینوں اشعار "بال جبریل" میں ہیں ایک شعر غزل ۴۲ میں ہے اور باقی دو اشعار نظم "ذوق وشوق" کے دوسرے بند میں ہیں۔

اقبال نے آپؓ کے لقب "شبیر" سے ایک اصطلاح "شبیری" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں تین اشعار ہیں۔ جن میں دو "بال جبریل" میں ہیں اور ایک "ارمغان حجاز" میں ہے "بال جبریل" کے دو اشعار میں ایک شعر غزل ۵۴ میں ہے اور دوسرا نظم "فقر" میں "ارمغانِ حجاز" کا شعر اس مجموعہ کی نظم "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے ساتویں بند میں ہے۔

(۷) حضرت خالد رضی اللہ عنہ: "کلیات" میں آپؓ کے نام سے ایک ہی شعر ہے جو "ضرب کلیم" کی نظم "آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر" میں ہے۔

(۸) **حضرت سلمان رضی اللہ عنہ:** "کلیات میں آپؓ کے نام سے کل دو اشعار ہیں جو دونوں "بانگ درا" میں ہیں ایک شعر نظم "بلالؓ" (بعد از نظم "چاند") کے دوسرے بند میں ہے۔ اور دوسرا نظم "شکوہ" کے اکیسویں بند میں ہے۔

اقبال نے "سلمان" سے ایک اصطلاح "سلیمانی" بھی وضع کی ہے جس سے "کلیات" میں چار اشعار ہیں ان چار میں ایک ایک شعر "بانگ درا" اور "بال جبریل" میں ہے اور دو "ضرب کلیم" میں "بانگ درا" کا شعر نظم "طلوع اسلام" کے چوتھے بند میں ہے اور "بال جبریل" کا شعر نظم "ایک نوجوان کے نام" میں ہے۔

"ضرب کلیم" کے دو اشعار ہیں ایک نظم "فقر و راہبی" میں ہے اور دوسرا نظم "محراب گلِ افغان کے افکار" کے آخری بند میں۔

(۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ: آپؓ کے نام پر تو کوئی شعر نہیں مگر اقبال نے آپؓ کے نام سے ایک اصطلاح "عثمان" وضع کی ہے جس سے "کلیات" میں ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم "جواب شکوہ" کے بیسویں بند میں ہے۔

(۱۰) حضرت علی رضی اللہ عنہ: حضرت علیؓ کے نام سے "کلیات" میں چار اشعار ہیں جن میں دو "بانگ درا" میں ہیں اور ایک ایک شعر "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں ہے، "بانگ درا" کے دو اشعار میں ایک نظم "زہد اور رندی" میں ہے اور دوسرا نظم "خضر راہ" کی ذیلی نظم "دنیائے اسلام" کے دوسرے بند میں، "بال جبریل" کا شعر اسکی ایک رباعی میں ہے جس میں اقبال نے حضرت علیؓ کو "خیبر شکن" کے لقب سے بھی نوازا ہے "ضرب کلیم" کا شعر نظم ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام میں ہے

اقبال نے حضرت علیؓ کے القاب سے چھ اصطلاحیں بھی وضع کی ہیں جن سے سولہ اشعار ہیں، اصطلاحیں یہ ہیں۔

(۱) اسداللّٰہی: اس اصطلاح سے تین اشعار ہیں جن میں دو "بانگ درا" میں ہیں اور ایک "بال جبریل" میں "بانگ درا" کے دو اشعار میں ایک شعر نظم" میں اور تو "بعد از نظم "شیکسپیئر" میں ہے اور دوسرا غزلیات حصہ سوئم کی آخری غزل میں ہے "بالِ جبریل" کا شعر اس کی غزل ۳۴ میں ہے

(۲) حیدرؓ: اس اصطلاح سے تین اشعار ہیں جن میں ایک "بانگ درا" میں ہے اور دو بال جبریل" میں بانگ درا" کا شعر نظم "طلوع اسلام" کے چوتھے بند میں" بال ابراہیم" کے دو اشعار میں ایک شعر اس کی رباعی میں ہے اور دوسرا غزل ۵ (اول) کے بعد ہے۔

(۳) حیدریؓ: اس اصطلاح سے "کلیات اقبال" میں پانچ اشعار ہیں جن میں "بانگ درا" اور ضرب کلیم" میں دو دو اشعار ہیں اور ایک شعر بال جبریل میں ہے

"بانگ درا" کے دو اشعار میں ایک شعر نظم "جواب شکوہ" کے بیسویں بند میں ہے اور دوسرا نظم" میں اور تو "بعد از نظم "شیکسپیئر" میں ہے" بال جبریل" کا شعر نظم" ایک نوجوان کے نام" کے پہلے بند میں ہے "ضرب کلیم" کے دو اشعار میں ایک شعر نظم "جلال و جمال" میں ہے اور دوسرا نظم محراب گل افغاں کے افکار کے دسویں بند میں ہے

(۴) حیدر کرار: اس سے کل دو اشعار ہیں ایک شعر "بال جبریل" کی غزل ۴۳ میں اور دوسرا "ضرب کلیم" کی نظم "آزادی شمشیر کے اعلان پر" میں ہے۔

(۵) کراری: اس سے "کلیات" میں دو اشعار ہیں ایک "بال جبریل" کی غزل ۱۴ (دوم) میں ہے اور دوسرا "ضرب کلیم" کی نظم محراب گل افغان کے افکار کے دسویں بند میں ہے

(۶) مرتضیٰؓ: اس کے کلام میں ایک ہی شعر ہے جو "بال جبریل" کی نظم "ساقی نامہ" کے

تیسرے بند میں ہے اس طرح حضرت علیؓ پر کلام میں کل بیس اشعار ہے۔

(۱۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ: "کلیات" میں آپ پر دو اشعار ہیں اور دونوں "بانگ درا" کی نظم صدیقؓ کے پہلے بند میں ہیں۔

(۱۲) حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا: آپؓ پر "کلیات" میں ایک ہی شعر ہے جو "بال جبریل" کی غزل (دوم) میں ہے۔

"کلیات اقبال" میں صحابہؓ اور صحابیہؓ پر اشعار کا گوشوارہ

نمبر شمار	صحابہؓ اور صحابیہؓ کے نام	تعداد اشعار
۱۔	حضرت ابوبکرؓ	۴
۲۔	حضرت ابوعبیدہؓ	۱
۳۔	حضرت ایوب انصاریؓ	۱
۴۔	حضرت بلالؓ	۵
۵۔	حضرت ابوذرؓ	۲
۶۔	حضرت حسینؓ	۶
۷۔	حضرت خالدؓ	۱
۸۔	حضرت سلمانؓ	۶
۹۔	حضرت عثمانؓ	۱
۱۰۔	حضرت علیؓ	۲۰
۱۱۔	حضرت عمرؓ	۳
۱۲۔	حضرت فاطمۃ الزہراؓ	۱
	میزان	۵۱

مسلمان اور جدید علوم وفنون

از پروفیسر عبدالاحد رفیق☆

کائنات کے مسخر کرنے اور سورج، چاند، ستاروں اور تمام ارضی وسماوی مخلوق کا انسان کا خدمت گار ہونے کا نظریہ اسلام نے اس وقت دنیا کو دیا تھا جبکہ مشرقی اور مغربی دنیا کی بہت سی قومیں سورج اور چاند اور ستاروں کو ایک مافوق الفطرت طاقت سمجھ کر ان کے آگے سر جھکائے ہوئے تھیں اور انہیں اپنا معبود تسلیم کرتی تھی اور دوسری طرف مطالعہ فطرت اور کائنات کے سربستہ رازوں کی دریافت کو کفر والحاد قرار دیتی تھیں، اقوام عالم جس وقت سائنس کے عناصر آگ، پانی، ہوا، بجلی، دریا، پہاڑ، سورج وغیرہ کو مافوق القوۃ اور مقدس اشیاء سمجھ کر ان کی پرستش میں لگی تھیں سب سے پہلے قرآن نے ہی یہ اعلان کیا تھا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ۲:۲۸)

وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

اور سب سے پہلے قرآن نے ہی عقل وخرد سے کام لینے کی دنیا بھر کو دعوت دی تھی اور فرمایا تھا:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران۳:۱۹۰-۱۹۱)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور دن رات کے الٹ پھیر میں بڑی نشانیاں ہیں، عقل مندوں کے لئے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر، اور غور کرتے رہتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار تو نے اس کو بیکار پیدا نہیں کیا۔

☆ اپر سورہ، سری نگر۔

اور دنیا کی تمام جائز اور پاکیزہ نعمتوں سے متمتع ہونے کے لئے قرآن ہی نے سب سے پہلے یہ تعلیم دی تھی:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (اعراف۷:۳۲)

کہو کس نے حرام کی اللہ کی وہ زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی، اور کھانے پینے کی پاک صاف چیزیں، کہئے یہ سب چیزیں اہل ایمان کے لئے ہیں، دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی زندگی میں ان ہی کے لئے سب نعمتیں۔

دشمنوں کی مدافعت اور اپنے وجود کے باقی رکھنے کے لئے ہر قسم کے جنگی سامان تیار کرنے اور ضروریات زمانہ کے مطابق وسائل وذرائع اختیار کرنے اور پیش آمدہ حاجات کے لئے ایجادات و اختراعات کا حکم بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے اپنے پیروؤں کو دیا تھا:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال۸:۶۰)

جہاں تک ہو سکے قوت و طاقت کے سامان پیدا کر کے اور گھوڑے تیار کر کے دشمنوں کے مقابلے کے لئے تیار رہو، اس تیاری سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر دھاک بٹھا کر رکھو گے اور ان لوگوں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں، لیکن اللہ جانتا ہے۔

اسلام کی یہی وہ تعلیم اور یہی وہ پیش کردہ تخیل تھا جن کی بنا پر مسلمانوں نے بعد میں ضروریات زمانہ کے مطابق علوم وفنون حاصل کئے اور ان کو درجہ کمال تک پہنچایا۔

منطق، انجینئرنگ، ریاضی، الجبرا، ہیئت، نجوم، طب، فلسفہ، فن تعمیر، صنائع، ادب، شاعری غرضیکہ ہر قسم کے علوم وفنون سیکھے اور دنیا کو ایک نیا اور اعلیٰ تمدن دیا۔

مسلمانوں کے یہی علوم وفنون تھے، جنھوں نے بالآخر مغربی دنیا کو اس قابل بنایا کہ اس نے

سائنس کے جدید ایجادات واکتشافات میں دنیا بھر کی امامت حاصل کی اور مسلمانوں نے اپنی غفلت اور ناعاقبت اندیشی سے جب سے قرآن کو چھوڑا تو ایک طرف روحانی اور اخلاقی دولت سے تہی دست ہوگئے اور دوسری طرف علوم وفنون اور سائنس کو بھی چھوڑ بیٹھے، اس طرح دین و دنیا دونوں کا نقصان اٹھایا، حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے ہی یورپ کو نشاۃ ثانیہ کے قابل بنایا ہے، اس کے ثبوت میں مغربی محققین اور مستشرقین ہی کے بیانات کے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔
جان ڈیوٹ رپورٹ لکھتا ہے۔

''تمام علوم مثلاً طبیعیات، نجوم، فلسفہ اور ریاضی جو چودہویں صدی عیسوی سے یورپ میں رائج ہوئے ہیں، وہ سب کے سب عربی مدارس سے منقول ہیں اس بنا پر ہسپانیہ کو یورپی فلسفہ کا موجد تسلیم کرنا چاہئے''۔

پروفیسر فلپ اپنے مذہبی تعصب کے باوجود قرون وسطی کے عربوں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہی مسلمان آگے چل کر قرونِ وسطی میں یورپ کو ایسے ذہنی اثرات کے منتقل کرنے کا وسیلہ بنے جنہوں نے مغربی دنیا کو بیدار کرکے اسے نشاۃ جدید کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے قابل بنادیا''۔

''انسانیت کی بہتری اور بھلائی کے لئے جیسی خدمات عربوں نے قرونِ وسطی کی ابتدا میں انجام دی ہیں ویسی خدمت کسی اور قوم نے انجام نہیں دی''

اس زمانہ میں جب کہ عرب علماء ارسطو کا مطالعہ کررہے تھے، یورپ میں شارلیمان اور اس کے امراء اپنے نام کے ہجے سیکھ رہے تھے، ایک اسلامی شہر قرطبہ ہی میں سترہ بڑے کتب خانے تھے، اور ان میں سے ایک ایک کتب خانے میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں، ایسے زمانے میں جب کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے علما حمام میں غسل کرنے کو بے دینوں کی رسم جانتے تھے، اسی قرطبہ کے مسلمان

سائنس داں پرتکلف اور نزہت بیز حماموں سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

مسلمانوں کے علوم وفنون کا حال پروفیسر حتی نے اپنی کتاب History of Arabs میں تفصیل سے لکھا ہے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

۱۔ خلیفہ المقتدر کے حکم سے ۹۳۱ء میں طبیبوں کا امتحان لینے کی غرض سے شہر بغداد میں ایک ممتاز طبیب سنان بن ثابت بن قرۃ کا تقرر عمل میں آیا، اس طبیب کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ صرف ایسے ہی طبیبوں کو علاج ومعالجہ کا اجازت نامہ عطا کرے، جو مقررہ شرطوں پر پورے اترے، شہر بغداد کے آٹھ سو آٹھ سے بھی زیادہ طبیبوں نے اس عمل امتحان میں کامیابی حاصل کی اور سارا دارالخلافہ غیر مستند اور اناڑی طبیبوں سے پاک ہوگیا''۔

ان حقایق سے صحت عامہ میں عربوں کی دانشمندانہ دلچسپی کی شہادت ایک ایسے زمانہ میں ملتی ہے جب کہ ساری دنیا ابھی اس کوچے سے ناآشنا تھی۔

رازی متوفی ۹۲۹ء نہ صرف پوری دنیائے اسلام میں بلکہ تمام قرون وسطی کے بدیع مفکروں اور طبیبوں میں سب سے زیادہ ذہین اور طباع مفکر اور طبیب ہوا ہے، وہ بغداد کا سب سے بڑا طبیب تھا، کہتے ہیں کہ بغداد کے ایک نئے بڑے شفاخانے پر گوشت کے ٹکڑے لگادیتے تھے اور اس مقصد کے لئے اس نے اسی مقام کو منتخب کیا تھا، جہاں گوشت کے سڑنے کی علامتیں سب سے کم پائی گئی تھیں، جراحی کی وہ سوئی جس سے زخم کھولا جاتا ہے اور جس کو انگریزی میں (Seton) کہتے ہیں اسی کی ایجاد سمجھی جاتی ہے۔ الکیمیا پر اس نے عظیم الشان کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک کتاب الاسرار بھی ہے، یہی کتاب الاسرار چودہویں صدی تک کیمیائی معلومات کا ایک زبردست سرچشمہ بنی رہی، لیکن رازی کا اہم ترین کارنامہ اس کی جامع کتاب الحاوی ہے، یہ کتاب طبی معلومات کی قاموس کے طور پر لکھی گئی تھی، اس میں ان تمام معلومات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جو اس زمانہ تک یونانی، ایرانی اور ہندوستانی طبی

ادب سے عربوں نے حاصل کی تھیں، عربی طب کی تاریخ میں رازی کے بعد دوسرا امتیاز نام ابن سینا کا ہے، جسے یورپ والے Avicenna کہتے ہیں، اس کی سب سے بلند پایہ قاموسی کتاب القانون فی الطب ہے، جس کا ترجمہ یورپ میں (Canon) کے نام سے کیا گیا ہے، اس زمانہ کے طبی ادب میں اس کتاب نے بتدریج وہ قدر و منزلت حاصل کر لی تھی کہ یورپ کی تمام طبی درسگاہوں میں اس کو درسی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، بارہویں صدی سے سترہویں صدی تک مغربی دنیا میں اس کتاب کو ایک زبردست طبی رہبر کی حیثیت حاصل رہی ہے، ڈاکٹر ولیم آسلر کے الفاظ میں یہ کتاب تمام دوسری طبی کتابوں کے مقابلہ میں طویل ترین مدت تک طب کی انجیل بنی رہی ہے۔

اسی صدی آٹھویں کے وسط میں خلیفہ مامون نے بغداد کے اندر اور دمشق کے باہر فلکیاتی رصدگاہیں قائم کرائیں، اس زمانے کی رصد گاہوں کا سارا سامان مزولہ اصطرلاب۔ مقیاس الارتفاع اور کرے پر مشتمل ہوتا تھا، خلیفہ کے ہیئت دانوں نے زمین کی مساحت کا ایک نازک ترین عمل یعنی ارضی زاویہ کے درجہ کا طول معلوم کیا، یہ ہیئت دان زمین کی گولائی کے مفروضے پر زمین کی جسامت اور اس کا محیط متعین کرنا چاہتے تھے، یہ پیمائش دجلہ کے شمالی میدان اور تدمر (Palmyra) کے قریب عمل میں لائی گئی تھی، یہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نصف النہار کے ایک درجہ کا طول ۵۶ ⅔ عربی میل ہے، بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ نتیجہ تقریباً صحیح نکلا کیوں کہ اسی مقام پر نصف النہار کے ایک درجہ کا جو حقیقی طول ہے اس سے ان ہیئت دانوں کا دریافت کیا ہوا طول صرف ۲۸۷۷ فٹ زیادہ ہے، الخوارزمی کی قدیم ترین فلکیاتی جدولیں وغیرہ ریاضی اور الجبرا کی قدیم ترین درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی، اسی ترجمہ کی بدولت یورپ الجبرا کے نام اور اس کے علم سے روشناس ہوا۔

جابر بن حیان کو جسے یورپ والے (Geber) کہتے ہیں، عربی الکیمیا کا موجد سمجھا جاتا ہے، جابر نے تحویل اور تجزیہ جیسے دو اہم کیمیائی تعاملات کی سائنٹفک طریقے پر تشریح کی ہے وہ تمام سلفیورک اور نائٹرک ترشوں (گندھک) اور شورے کے تیزاب کی تیاری سے واقف تھا، ان دونوں

ترشوں کو ملا کر ماء الملوک تیار کرنا بھی اسے آتا تھا جس میں سونے اور چاندی کو حل کیا جا سکتا تھا، مجموعی حیثیت سے جابر نے ارسطو کے نظریہ اجزائے دھات میں کچھ اس طرح ترمیم کی کہ یہ نظریہ معمولی رد و بدل کے ساتھ جدید کیمیا کی ابتداء یعنی اٹھارہویں صدی تک مروج و مقبول رہا۔

بطلیموس کی کتاب جغرافیہ کا عربی میں کئی بار ترجمہ راست یونانی یا سریانی سے کیا گیا، اور اسی سے الخوارزمی نے زمین کا نقشہ تیار کیا، اصل میں یہ دنیا کا نقشہ تھا اسے خوارزمی اور دوسرے ساٹھ علماء نے مل کر تیار کیا تھا، اور یہ اسلام میں کرۂ ارض اور اجرام فلکی کا سب سے پہلا نقشہ تھا۔

مسلم اسپین کا سب سے زبردست اور جید عالم اور بدیع مفکر علی ابن حزم گزرا ہے، یہ ۹۹۴ء میں تولد ہوا اور ۱۰۶۴ء میں فوت ہوا، علی بن حزم کا شمار ایسے دو تین اسلامی مصنفوں میں ہوتا ہے جن کا ذہن نہایت شاداب اور جن کی تصانیف بے شمار ہیں، سوانح نگاروں نے تاریخ، فقہ، حدیث، منطق، شاعری اور متعلقہ موضوعات کی کوئی چار سو کتابیں اس نے مکتوب کی ہیں۔

مغربی مسلمانوں نے ادب اور تاریخ کے میدان میں جو کمال دکھائے ہیں ان میں بنی نصر کے دربار کے دو عہدہ دار دوستوں یعنی ابن الخطیب اور ابن خلدون کا مرتبہ بہت بلند ہے، ابن خطیب نے شاعری، تاریخ، جغرافیہ، طب اور فلسفہ پر ساٹھ کتابیں لکھی ہیں۔

ابن خلدون کو اپنے مقدمہ (تاریخ) کی بناء پر بڑی شہرت حاصل ہوئی، اس میں اس نے پہلی بار تاریخ کے ارتقاء کا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس نظریہ میں اخلاقی اور روحانی قوتوں کے سوا آب و ہوا جغرافیہ کے طبعی حقائق میں پورے وقوف و آگہی کے ساتھ بیان کئے ہیں، قومی عروج و زوال کے قوانین کی دریافت اور ان کی تدوین کی سب سے پہلی کوشش ابن خلدون ہی نے کی ہے، اس لئے ابن خلدون کو...... جیسا کہ خود اس نے دعویٰ کیا ہے، فن تاریخ کی اہمیت اور اس کی وسعت کا انکشاف کرنے والا کم سے کم عمرانی علوم کا حقیقی بانی کہا جا سکتا ہے، یہ واقعہ ہے ابن خلدون سے پہلے تاریخ پر مجموعی حیثیت سے ایسی وسیع اور فلسفیانہ نظر، یورپ والوں کا ذکر ہی کیا کسی عرب مصنف نے بھی نہیں ڈالی تھی،

ابن خلدون نے ۱۴۰۶ء میں وفات پائی، دنیا نے اسکے کارناموں پر جتنی تنقیدیں اور تبصرے کئے ہیں ان سب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ وہ اسلام کا عظیم ترین اور دنیا کا زبردست مفکر تاریخ گزرا ہے۔

"اشبیلیہ کے ابن العوام نے بارہویں صدی کے آخر میں زراعت پر ایک رسالہ لکھا ہے، اپنے موضوع پر نہ صرف اہم ترین اسلامی رسالہ مانا جاتا ہے، بلکہ سارے قرون وسطی میں اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں منظر عام پر آئیں ان سب میں اس رسالہ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔"

اسپین بلکہ اسلامی دنیا کا مشہور ترین عطار اور ماہر نباتیات عبداللہ بن احمد بن بیطار گزرا ہے۔

الکندی کا کارنامہ بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے، فلسفی کی حیثیت سے انہوں نے افلاطون اور ارسطو کے نظریوں کا نو افلاطونیوں کے انداز میں باہم آمیز کرنے کی کوشش کی تھی اور نوفیثا غورثی ریاضیات کو وہ پورے سائنس کی اصل سمجھتا تھا، وہ الکمیادان اور ماہر بصریات بھی تھا، بصریات کے موضوع پر اس کی ایک اہم کتاب جو اقلیدس کی کتاب بصریات Optics پر مبنی ہے، ایک عرصہ تک مشرق اور مغرب میں کثرت سے مستعمل رہی، راجر بیکن بھی اس کتاب سے متاثر ہوا ہے۔

خورستان کے شہر تستر اور سوس میں کئی کارخانے ایسے تھے جو دمشق (کپڑے کی ایک قسم) جو ابتدا میں دمشق میں تیار ہوتا تھا، اس کی زردوزی اور نقلی ریشم کے پردوں کے لئے مشہور تھے، شیراز میں اُون کی دھاری دار عباؤں کے سوا جالیاں کمخواب اور زربفت کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے، قرونِ وسطی کی یورپین خواتین اپنے شہروں کی دکانوں سے ایرانی ریشمی کپڑا خریدا کرتی تھیں۔

مشرق میں مسلمان تاجروں کے قافلے چین تک پہنچ گئے تھے، یہاں انکی تجارت ریشم پر مبنی تھی، ایران اور عراق کے اکثر علاقوں میں اعلی درجہ کے قالین اور کپڑے تیار ہوتے تھے، کوفہ میں ریشم پیدا ہوتا تھا، یہاں سر کے ریشمی رومال بھی بنے جاتے تھے۔

صوبہ صید اور دوسرے شامی شہروں کے شیشے صفائی اور نزاکت کے لحاظ سے ضرب المثل بن گئے تھے، شام میں شیشے اور دھات کے جو ظروف بنائے جاتے تھے، ان کی مانگ برتنے اور تزئین و

آرائش کے لئے بہت زیادہ تھی۔

اسلامی اندلس اور اطالیہ سے بارہویں صدی میں کاغذ سازی کی صنعت نصرانی یورپ میں منتقل ہوئی اور یہاں متحرک ٹائپ کے ذریعہ طباعت کی دریافت ہوئی، اس صنعت نے تعلیم عام کی اشاعت کے امکان پیدا کئے جس سے آج یورپ اور امریکہ دونوں بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

مولانا حالیؒ مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے:

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا — تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیوں کا نشاں تھا — عراقِ عرب جس سے رشکِ جناں تھا
اُڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیلِ تاتار جس کو

سمرقند سے اندلس تک سراسر — انہیں کی رصد گاہیں تھیں جلوہ گستر
سوادِ مراغہ میں اور قاسیوں پر — زمیں سے صدا آرہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

مورخ ہیں جو آج تحقیق والے — تفحص کے ہیں جن کے آئیں نرالے
جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے — زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے
عرب ہی نے دل ان کے جا کر ابھارے
عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے ترارے

اندھیرا تواریخ پر چھا رہا تھا — ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
درایت کے سورج پر ابر آرہا تھا — شہادت کا میدان دھندلا رہا تھا
سرِ رہ چراغ اک عرب نے جلایا
ہر اک قافلہ کا نشاں جس سے پایا

استفسار و جواب

علامہ شبلی پر تحریف کا الزام

مفتی محمد طاہر مدرسہ دینیہ اشاعت العلوم کوٹلہ "الدیوبندیہ" نامی کتاب میں سیرۃ النعمان کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے، اسکا مستفاد یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اعمال کے جزِ ایمان نہ ہونے کے ثبوت میں جن آیتوں سے استدلال کیا ہے ان سے بداہتاً ثابت ہوتا ہے کہ ایمان و عمل دو چیزیں ہیں، کیونکہ ان تمام آیتوں میں عمل کو ایمان پر معطوف کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جز کل پر معطوف نہیں ہوسکتا، دوسرے [مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحاً تغابن ۶۴:۹] کو علامہ شبلی نے تحریف کرکے [من یو من باللہ فیعمل صالحا] کردیا اور لکھا کہ اس میں حرف تعقیب ہے جس سے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کی رائے قطعی طور پر صحیح ثابت جاتی ہے، ثالثاً علمائے اہل حدیث نے سیرۃ النعمان کے رد میں جو کتابیں لکھیں ان میں حسن البنیان فیمانی سیرۃ النعمان دہلی سے ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوئی، اس میں اس تحریف کی نشان دہی کی گئی مگر اسکے بعد سیرۃ النعمان کا جو دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اس میں کوئی اصلاح و ترمیم نہیں کی گئی۔

کیا یہ اعتراضات صحیح ہیں؟

معارف: سیرۃ النعمان پہلی مرتبہ ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی، دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی یہاں سے شائع ہوئی، کتب خانہ دارالمصنفین میں سیرۃ النعمان کا سب سے قدیم نسخہ مطبع مجتبائی دہلی کا ہے جو ۱۹۱۲ء میں مصنف کی حیات میں طبع ہوا ہے، اس میں زیر بحث مسئلہ کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

"الذین آمنوا وعملوا الصلحات - ومن یو من باللہ ویعمل صالحا،

اس قسم کی اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان جاتا نہیں رہتا (ص ۱۲۳) امام صاحب نے جس خوبی سے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے، انصاف یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امام صاحب نے قران کی جو آیتیں استدلال میں پیش کی ہیں ان سے بداہتاً ثابت ہوتا ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں کیونکہ ان تمام آیتوں میں عمل کو ایمان پر معطوف کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جز کل پر معطوف نہیں ہوسکتا (ص ۱۲۵)

اس مسئلہ میں آیت کی تحریف اور حرف فا سے استدلال کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، اور اسی نسخہ کو پیش نظر رکھ کر سیرۃ النعمان کا جدید ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں طبع ہوا ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۱۲ و ۱۱۴)

دراصل یہ مولانا شبلی پر سراسر اتہام ہے، بعض خودغرض ناشرین بے شرمی اور ڈھٹائی سے دارالمصنفین کی کتابیں چھاپتے رہتے ہیں، ممکن ہے اس طرح کے کسی ایڈیشن میں الحاق ہو، ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری نہ مولانا شبلی پر ہے اور نہ دارالمصنفین پر۔

ع۔ع

وفیات

جناب نعیم صدیقی

یہ خبر رنج وافسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جماعت اسلامی پاکستان کے قدیم رکن اور برصغیر کے ممتاز صاحبِ علم وقلم اور اچھے شاعر و ادیب جناب فضل الرحمان نعیم صدیقی نے ۲۵ ستمبر کو داعی اجل کو لبیک کہا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۵ برس تھی۔

نعیم صاحب جماعت کے تاسیسی ارکان اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تربیت یافتہ اور معتمد لوگوں میں تھے، جس زمانے میں ترجمان القران پٹھانکوٹ سے شائع ہوتا تھا، اسی زمانے سے ان کی نگارشات اس میں چھپ رہی ہیں، مولانا امین احسن اصلاحیؒ وغیرہ کی جماعت سے علاحدگی کے بعد جولوگ مولانا مودودی کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں یہ علمی وادبی حیثیت سے زیادہ فائق تھے اور مولانا کے بعد سب سے زیادہ تحریری سرمایہ اور لٹریچر ان ہی نے یادگار چھوڑا ہے، جن سے جماعت کا ذہن اور مزاج بنانے میں بڑی مدد ملی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم میں قیادت کا مادہ اور تنظیمی صلاحیت خاطر خواہ نہیں تھی اس لئے وہ نہ جماعت کے عہدوں پر فائز ہوئے اور نہ انہیں تنظیمی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں لیکن ان کا شمار جماعت کے فکری رہنماؤں میں ہوتا ہے ان کا ذوق متنوع تھا اور وہ علمی وادبی ہر طرح کے مضامین لکھتے تھے ایک زمانے میں ترجمان القرآن کا شاید ہی کوئی شمارہ ان کے مضامین سے خالی رہتا۔ باہو، مولانا مودودیؒ کی زندگی میں ان کی حیثیت ترجمان القرآن کے نائب مدیر کی تھی۔ اس کی وجہ سے اوران کی علمی وتصنیفی قابلیت کی بنا پر خیال تھا کہ مولانا کے بعد وہی رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں گے اور شروع میں یہ ذمہ داری ان کے سپرد بھی ہوئی تھی۔

نعیم صدیقی صاحب کو شعر وادب سے زیادہ مناسبت تھی، اس میدان میں انہوں نے اپنے خوب جوہر دکھائے ہیں، راقم نے سب سے پہلے ان کی ادبی کتاب "ذہنی زلزلے" ہی پڑھی تھی۔ مدت سے ان کی ادارت میں "سیارہ" نکل رہا ہے جو پاکستان کا ایک مقبول ادبی رسالہ ہے اس کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے جن میں "اقبال نمبر" زیادہ مشہور ہے۔ ترجمان القرآن میں کتابوں پر تبصرے انہیں کے قلم سے ہوتے تھے، اخباروں میں بھی برابر مضامین لکھتے تھے۔ ملک کے مشہور صحافی ملک نصر اللہ خاں عزیز کی ادارت میں نکلنے والے کوثر وتسنیم میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، ان کی تعلیم کا حال معلوم نہیں، تاہم انگریزی اور عربی کی استعداد اچھی اور مطالعہ وسیع تھا مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی صحبتوں سے بھی ان کو فیض پہونچا ہوگا، اسی لئے دینی مسائل وموضوعات میں بھی ان کا قلم رواں دواں رہتا تھا ان کی اکثر کتابیں تحریکی اور جماعتی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں لیکن یہ سب کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں ان کی سب سے مقبول کتاب "محسن انسانیت" ہے، یہ بھی تحریکی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے لیکن اپنے انوکھے انداز اور مشمولات کے لحاظ سے یہ سیرت کی اہم اور مفید کتابوں میں خیال کی جاتی ہے۔ مرحوم اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ غزلیں اور نظمیں دونوں کہتے تھے متعدد شعری مجموعے چھپے ہیں جن میں نعت اور منقبت کا مجموعہ بھی ہے، ان کی شاعری انکے دینی احساسات وجذبات کی ترجمان اور ہر قسم کے باطل اور غلط افکار ورجحانات کا رد ہوتی تھی، مصر میں اخوان المسلمون کے رہنما سید قطب کو پھانسی دی گئی تو انہوں نے "یہ کون ہے کس کا خون بہا؟" کے عنوان سے بڑی پر درد نظم کہی جو ان کے اسلامی جوش وجذبہ اور شدت تاثر کی بنا پر بہت مقبول ہوئی ان کی ایک اور نظم "خدا دیکھ رہا ہے" کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اتنا پسند کیا کہ اپنے اخبار "صدق جدید" میں بڑا پراثر نوٹ قلم بند کیا۔

اللہ تعالیٰ علم ودین کے اس شیدائی کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے۔ آمین۔

پروفیسر اکبر رحمانی

جناب اکبر رحمانی کی وفات ایک قومی وملی حادثہ ہے، وہ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ تھے، اس کے باوجود بڑی سرگرمی سے تعلیمی، ادبی اور علمی خدمات بھی انجام دے رہے تھے، لیکن وظیفہ یاب ہونے کے بعد وہ محض علمی مشاغل اور تصنیف وتالیف کے لئے وقف ہوگئے تھے، اس کی وجہ سے خیال تھا کہ اب قوم کو ان کی ذہنی ودماغی قابلیت سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کا موقع ملے گا، مگر دستِ اجل نے ان کو ہم سے چھین لیا۔ اور ۱۷ر ستمبر کو وہ جوارِ رحمت میں پہونچ گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ ذیابیطس اور کئی موذی امراض میں مبتلا تھے، گردے بھی خراب ہوگئے تھے، دو سال پہلے حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تھے وہیں گینگرین کے سبب سے دائیں پاؤں کا انگوٹھا کاٹنا پڑا۔ اور ہندوستان واپس آنے کے بعد گھٹنے تک دایاں پاؤں ہی کاٹ دیا گیا مگر ایک بندۂ مومن کی طرح وہ ان آزمائشوں کا صبر وشکر سے مقابلہ کرتے اور ہمہ تن اپنے تحریری اور تصنیفی کام انجام دیتے رہے کہ یکایک ان کی وفات کی خبر نے سب کو تڑپا دیا۔

مرحوم کا اصل نام اکبر خاں اور والد کا رحمان خاں تھا ان دونوں کے امتزاج سے انہوں نے اپنا قلمی نام "اکبر رحمانی" رکھ لیا تھا اور اسی سے روشناس تھے۔

اکبر صاحب کا خاندانی تعلق لودھیوں سے تھا ان کے آبا واجداد ابراہیم لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے، آبائی وطن گنگا پور (اورنگ آباد دکن) تھا ۱۷ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی وثانوی تعلیم جلگاؤں میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم پونا اور بمبئی کی یونیوسٹیوں میں پائی، اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی، ہندی اور مراٹھی زبانوں سے واقف تھے، ہندی اور مراٹھی کے مضامین اور کہانیوں کے اردو ترجمے برابر کرتے رہتے تھے، افکار کراچی میں بھی ان کے ترجمے چھپتے تھے، برسوں روزنامہ انقلاب بمبئی کا ہفتہ وار کالم "مراٹھی اخبارات کی جھلکیاں" اور

اردو ٹائمز بمبئی کا "ہندی اخبارات کی جھلکیاں" لکھا اور ہندی میں بعض کتابیں بھی لکھیں۔

وہ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اس لئے تعلیم وتدریس اور ان سے متعلقہ مسائل پر برابر مفید مضامین لکھتے رہتے تھے، اسی مقصد سے ایک تعلیمی رسالہ "آموزگار" نکالا تھا۔ جو اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے، فرقہ وارانہ اور تنگ نظر ذہن کے لوگ درسی وغیر درسی خصوصاً تاریخ اور نصابی کتابوں میں جو زہر بھرتے رہتے تھے یا اردو یا اقلیتوں کے ساتھ جس طرح کی زیادتیاں اور ناانصافیاں ہورہی تھیں ان کا تدارک کرنا انہوں نے اپنا فرض بنالیا تھا، اپنے وسیع تعلیمی تجربات کی بنا پر وہ سرکاری اور غیر سرکاری متعدد تعلیمی اور نصابی کمیٹیوں کے ممبر تھے، کئی درسی کتابوں کی تدوین کا کام بھی انجام دیا۔

اکبر رحمانی صاحب نے درجنوں مفید کتابیں لکھیں جن میں حسب ذیل چھپ گئی ہیں:-

(۱) بچوں کی کہانیاں اول ودوم (۲) تحقیقات وتاثرات (۳) قومی یک جہتی اور نصابی کتابیں (۴) اقلیتوں کے تعلیمی حقوق ومسائل (۵) اردو میں ادبِ اطفال ایک جائزہ (۶) تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق (۷) آموزگار اقبال (۸) اردو مدارس کے معیار تعلیم کا مسئلہ (۹) علی گڑھ سے دیو بند تک (۱۰) سخن ہائے گفتنی (۱۱) اورنگ زیب کی داستانِ معاشقہ۔ افسانہ یا حقیقت (۱۲) مراٹھی نامہ وغیرہ

ابھی متعدد کتابیں شائع نہیں ہوسکی ہیں، خاندیش کی تاریخ بڑی محنت وتحقیق سے لکھی تھی اور غالباً اب چھپ بھی گئی ہو مگر افسوس خود وہ اسے مطبوعہ صورت میں نہ دیکھ سکے۔

اکبر رحمانی صاحب اپنی گوناگوں علمی وتعلیمی خدمات کی وجہ سے کئی اداروں اور علمی وتعلیمی کمیٹیوں کے ممبر تھے، انھوں نے اپنے علاقے میں اردو تحریک کی قیادت بھی کی، انجمن ترقی اردو ہند کی ضلعی شاخ کے صدر رہے، مہاراشٹر اردو اکادمی کے بھی برابر رکن نامزد کئے جاتے تھے، اپنے علاقے میں مقبول اور ہر دل عزیز تھے، وہاں کی متعدد انجمنوں کی سربراہی کی، مساجد ومقابر اور دوسری ٹرسٹوں کے صدر، سکریٹری اور ممبر منتخب کئے جاتے تھے۔

رحمانی صاحب نے اپنے قلم کا ہی لوہا نہیں منوایا بلکہ وہ تقریر و خطابت کے بھی مرد میدان تھے، اچھی تقریریں کرتے تھے، ان میں الجھے مسائل اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی اچھی صلاحیت تھی۔

مختلف اداروں نے ان کی خدمات اور قابلیت کی بنا پر انہیں اعزاز اور ایوارڈ سے نوازا، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں وقتاً فوقتاً شریک ہوتے تھے ان سے میری پہلی ملاقات جنوب مشرق ایشیائی سیمنار خدا بخش لائبریری پٹنہ، بہار میں ہوئی جہاں انھوں نے بعض تعلیمی امور و مسائل کے متعلق مجھ سے کچھ سوالات کئے جن کا جواب ریکارڈ کر لیا تھا اور بعد میں اسے ''آموزگار'' میں شائع کیا۔ اس کے بعد میرے ان سے بڑے روابط ہو گئے تھے، اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ وہ تعلیمی کارواں کے ساتھ جس کے قافلہ سالار جناب سید حامد تھے دارالمصنفین تشریف لائے اسی طرح جامعۃ الفلاح میں بھی کسی پروگرام کے تحت آئے تو کئی روز یہاں قیام کیا، اس عرصے میں ان کا زیادہ وقت دارالمصنفین کے کتب خانہ میں گزرتا تھا، ہر وقت کتابوں کے مطالعہ میں منہمک رہتے تھے۔

وقتاً فوقتاً معارف میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، ادھر ڈاکٹر اقبال خصوصاً ان کے مکاتیب رحمانی صاحب کی دلچسپی اور تحقیق کا خاص موضوع ہو گیا تھا، اس سے متعلق ان کے کئی مضامین شائع ہوئے، لمعہ حیدرآبادی پر بھی ان کا کام تھا، انہوں نے ان کے نام کے ڈاکٹر صاحب کے بعض خطوط کی نشاندہی کی تو بعض حضرات خصوصاً ماسٹر اختر صاحب (بھوپال) کو اس سے شدید اختلاف ہوا۔ اس کی وجہ سے دونوں میں بڑی نوک جھونک رہی۔

ڈاکٹر اکبر رحمانی کی زندگی علم و ادب کی خدمت اور تحقیق و تنقید میں گزری، تعلیمی محاذ پر انھوں نے بے مثال کام کیا تا عمر غیر مسلم متعصب اہل قلم اور میڈیا کے زہر کا تریاق مہیا کرتے رہے۔ مسلمانوں میں اس طرح کے علمی و تعلیمی کام خاموشی اور خلوص سے انجام دینے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر و قرار نصیب کرے۔

مرحوم کے بڑے صاحب زادے سہیل اختر حوصلہ مند معلوم ہوتے ہیں، لیکن ابھی لائق تربیت ہیں۔ تاہم وہ اپنے والد بزرگوار کے کاموں کو جاری اور ناتمام کو مکمل کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی ہمت و توفیق دے آمین۔ ''ض''

ادبیات

صدای کشتگاں

از: ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی ☆

گہ بہ دست رہزنان کشتہ شویم — گہ بہ دست رہبران کشتہ شویم
گاہ در آسام وگہ در بمبئی — بی خیال وبی گمان کشتہ شویم
گاہ در گجرات و در سورت گہی — زین کران تا آن کران کشتہ شویم
گاہ در دہلی ،گہی در دہرہ دون — گاہ دردیگر مکان کشتہ شویم
گہ نوا کھالی ، گہی جمشید پور — ہم دراین وہم در آن کشتہ شویم
در روڑ کیلا و در کلکتہ ہم — بی چنین وبی چنان کشتہ شویم
گہہ مرادآباد و در میرٹھ گہی — کودک وپیر وجوان کشتہ شویم
گاہ در ملیانہ ، گہہ ہاشم پورہ — سوختہ دل، خستہ جان کشتہ شویم
گاہ بھاگلپور و گہ در شاملی — در ہجوم طاغیان کشتہ شویم
گاہ در بھوپال وگہ در آندھرا — از قضای ناگہان کشتہ شویم
در بنارس گاہ وگہ در کانپور — بی ضمان وبی امان کشتہ شویم
در بھونڈی گاہ ودر بجنور گاہ — در بدایون ہم چناں کشتہ شویم
در علی گڑھ گنجدنڈوارا نگر — چون کہ ما مستضعفان کشتہ شویم
بازدر گجرات حال ما بہ بین — چند گاہ وہم چساں کشتہ شویم
گاہ در بازارہا، در راہ ہا — بی خبر ازخان و ماں کشتہ شویم
گاہ خفتہ اندرونِ خانہ ہا — وقت شبہا ناگہان کشتہ شویم
در مساجد وقتِ سجدہ در نماز — ناگہان تسبیح خان کشتہ شویم
روزہ می گیریم در زندان رویم — پس بغیر آب ونان کشتہ شویم
گاہ دست وپایِ ما پارہ کنند — گہ بریدہ قیمہ سان کشتہ شویم
گہ چو ، چوبِ خشک سوزانند مان — گہ چو شمعِ بی زبان کشتہ شویم
وارہیم از دست شہریہا اگر — با سلاحِ شُرطیان کشتہ شویم
ہم چو مورِ زیرِ پا از سالہا — ہر زمان وہر مکان کشتہ شویم
مختصر این است بی جرم وخطا — اندرین ہندوستان کشتہ شویم
از چہ کس جو یا شویم انصاف را — چون بہ امر حاکمان کشتہ شویم

ای خدای اہل ایمان تابہ کی
مابہ دست کافران کشتہ شویم

☆ لوکو کالونی۔ نئی آبادی، علی گڈھ

اشکہائے غم

(قاضیِ شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، کے سانحہ ارتحال پر)

از: جناب وارث ریاضی صاحب☆

اک سانحہ عجیب یہ دہلی میں ہوگیا — "علم و عمل کا چاند" ستاروں میں کھوگیا
رخصت ہوا جہان سے وہ پیکرِ خلوص — ہر آشنائے مہر و وفا جس کو رو گیا
وہ صدرِ بزم (۱) ملتِ بیضا فقیہہ عصر — روپوش آج سب کی نگاہوں سے ہو گیا
وہ نائبِ امیرِ شریعت (۲) زعیم (۳) قوم — صد حیف وہ بھی شہرِ خموشاں میں کھوگیا
وہ جس نے اہلِ علم کے قلب و دماغ میں — بحث (۴) و نظر کے لعل و جواہر پروگیا
وہ رہنمائے صدق و صفا، منبعِ وفا — کینہ کشوں کے دل سے تعصب کو دھوگیا
حکمت (۵) فشاں ہے اس کا دبستان (۶) آگہی — جہدِ عمل وہ گلشنِ دانش میں بو گیا
اہلِ خرد نے لاکھ جگایا نہ اٹھ سکا — وہ ایسی گہری نیند اپولو (۷) میں سو گیا
قدرت کا یہ اصول ازل سے ہے آج تک — واپس نہیں ہوا ہے وہ دنیا سے جو گیا
وارث وہ فخرِ قوم و وطن کر کے سوگوار — ہر دل میں درد و کرب کا نشتر چبھو گیا

اس کی لحد پہ رحمتِ باری مدام ہو
جلوہ فشاں نوازشِ خیرالانام ہو

---

(۱) صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (۲) نائب امیر شریعت، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ۔ (۳) سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل (۴) فقہ اکیڈمی کا سہ ماہی علمی مجلہ قاضی صاحب جس کے بانی بھی تھے اور تادم حیات مدیر اعلیٰ بھی۔ (۵) "حکمت" کو یہاں علم نبوت کے معنی میں استعمال کرلیا گیا ہے۔ (۶) المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء جس کا قیام قاضی صاحب کی مساعی جمیلہ سے عمل میں آیا (۷) اپولو ہاسپٹل (دہلی) جہاں ۴/اپریل ۲۰۰۲ء کو اولِ شب میں قاضی صاحب کا سانحہ ارتحال پیش آیا۔

☆ کاشانۂ ادب سکٹا (دیوراج) مغربی چمپارن، بہار۔

غزل

از: وسیم انصاری رودولوی مرحوم

تجھے دیکھا ہے تیری شکل و صورت کہہ نہیں پاتے — زبان رکھتے ہوئے اہلِ بصیرت کہہ نہیں پاتے
مشابہ ہیں بہت کچھ پھر بھی سن لو اے وطن والو — کہ ہم صبحِ وطن کو شامِ غربت کہہ نہیں پاتے
گریباں کو بتاتے ہیں کرشمہ دستِ وحشت کا — مگر ان کے تبسم کی حکایت کہہ نہیں پاتے
گلوں کو چاک دامن فصلِ گل میں جب سے دیکھا ہے — فسانہ ہم بہ عنوانِ محبت کہہ نہیں پاتے
محبت کو ہم افسانہ بنا کر پیش کرتے ہیں — قیامت ہے حقیقت کو حقیقت کہہ نہیں پاتے
یہ مانا خوف ہے دار و رسن کا حق کے کہنے میں — مگر اندھیر ہے ظلمت کو ظلمت کہہ نہیں پاتے

تیرے جلوے نظر کے سامنے ہر وقت رہتے ہیں
مگر کیسی ہے تیری شکل و صورت کہہ نہیں پاتے

غزل

از: جناب اقبالؔ رودولوی☆

دل کا ہر زخم مہکتا دیکھوں — پھر تجھے انجمن آرا دیکھوں
اے مری صبح زر افشاں آخر — اور کب تک ترا رستہ دیکھوں
یوں بھی آجائے کبھی فصل جنوں — رقص کرتی ہوئی دنیا دیکھوں
آرزو ہے کہ محبت کے لئے — سب کو ہوتے ہوئے رسوا دیکھوں
آدمی وہ بھی ہے میری ہی طرح — کیسے دشمن کو تڑپتا دیکھوں
میرا سایہ بھی میرے ساتھ نہ ہو — خود کو یوں بھی کبھی تنہا دیکھوں

آرزو ہی رہی اقبالؔ کہ میں
کوئی اپنا بھی شناسا دیکھوں

☆ درگاہ شریف رودولی فیض آباد۔

مطبوعات جدیدہ

"دی لائٹ آف دی ہولی قرآن (نور القرآن فی تفسیر القرآن) از مجموعہ علمائے مسلمین، قدرے بڑی تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات جلد ا (۳۶۸) جلد دوم (۳۲۸) حصہ اول (۳۹۴) ناشر: دی سائنٹفک اینڈ ریلیجیس ریسرچ سنٹر، امیر المومنین علی پبلک لائبریری، اصفہان، ایران۔

ایران میں علامہ خمینی کے اسلامی انقلاب کے بعد علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں جو ادارے سرگرم عمل ہوئے ان میں اصفہان کا مکتبۃ الامام امیر المومنین علی العامہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، ہمارے سامنے اس کی شائع کردہ جدید انگریزی تفسیر کی تین جلدیں ہیں، پہلے حصے میں سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آیت صبر وصلوٰۃ تک اور بقیہ دونوں جلدوں میں سورہ الدھر سے سورہ الناس تک سورتیں شامل ہیں، مقدمہ سے علم ہوتا ہے کہ اولاً یہ مہتم بالشان کام علماء کی ایک جماعت کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن ترجمہ وترتیب میں سید عباس صدر آملی، سید کمال فقیہ ایمانی اور ایک امریکی نومسلم خاتون کی محنت وسعی کا خاص دخل ہے، تفسیر کی غرض مقدمہ میں واضح کردی گئی ہے کہ یہ انگریزی داں طبقہ تک قرآن مجید کے پیغام کو عام اور مستشرقین کی دانستہ غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے ہے، ایک مستقل باب میں قرآن مجید کے اکثر مغربی اور انگریزی ترجموں کو اس لئے ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے کہ ان میں حقایق کو مسخ کیا گیا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ مترجمین نے عبداللہ یوسف علی اور مارماڈیوک پکتھال کے ترجموں سے استفادہ کیا ہے، البتہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی انگریزی تفسیر کا ذکر نہیں، حالانکہ اس کی اہمیت ترجمہ وتفسیر دونوں طرح سے کہیں زیادہ ہے، ترجمہ وتفسیر کے علاوہ ائمہ معصومین خصوصاً باقر العلوم کو تاریخ کی بلند ترین شخصیت سے تعبیر کیا گیا، عموماً مسلکی غلو کا احساس نہیں ہوتا لیکن تفسیری آراء میں امام جعفر صادق اور دوسرے ائمہ شیعہ کے اقوال کثرت سے ہیں، آیت اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کے تحت نبوت،

رسالت اور امامت کی تشریح میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شیعی نقطۂ نظر کو تفصیل سے بیان کیا گیا کہ امامت، نبوت ورسالت سے بلندتر درجہ کی حامل ہے، اسی طرح اَیْنَ مَاتَكُوْنُوْا یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا کی تشریح میں امام مہدی منتظر کی آمد کے متعلق اقوال جمع کئے گئے ہیں، لیکن ایسے مقامات کم ہیں۔

"منتخب احادیث: از حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی، ترتیب وترجمہ جناب مولانا محمد سعد کاندھلوی متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۸۰۸، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ فیض عام، بستی نظام الدین اولیا، نئی دہلی۔

حضرت مولانا الیاس کاندھلوی کی تبلیغی جماعت کے دائرہ کار کی وسعت، مقبولیت اور افادیت میں اس کے نصاب کی چھ مشہور باتوں کا خاص دخل ہے، روز اول سے اس جماعت کے طریقہ کار میں کلمہ طیبہ، نماز، علم وذکر، اکرام مسلم، اخلاص نیت، دعوت وتبلیغ اور ترک لایعنی پر خاص محنت کی جاتی ہے، ان چھ باتوں میں ایمان، اسلام، احکام اور اخلاق کا گویا عطر کشید کرلیا گیا ہے، امیر التبلیغ، مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے ان کے متعلق آیات قرآنی اور احادیث شریفہ کا ایک انتخاب تیار کیا تھا، زیر نظر مجموعہ اسی انتخاب کا اردو ترجمہ ہے، جس میں لایق مترجم نے سلیس اور عام فہم ترجمہ کے علاوہ متن حدیث کی تصحیح، رواۃ کی جرح وتعدیل اور احادیث کی فنی حیثیت کی وضاحت کا اہتمام بھی کیا ہے، منتخبات احادیث کے باب میں یہ مجموعہ انفرادی شان کا حامل ہے اور اسی لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس کو مجموعہ سے زیادہ موسوعہ سے تعبیر کیا ہے۔

"سیرت بے مثال (حصہ اول)" از: جناب ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت وطباعت، مجلد، صفحات جلد ۳۵۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس دعوۃ القرآن، جین پور، اعظم گڈھ۔

سیرت طیبہ کا یہ جدید مرقع، لایق مصنف کے الفاظ میں کسی تاریخی ترتیب اور سیرت نگاری کے جدید اسلوب کا حامل ہونے کی بجائے گلشن سیرت کے دلکش پھولوں کا ایک گلدستہ ہے، جس سے

مشام جاں کو معطر کیا جاسکتا ہے، حالانکہ عرب، ام القریٰ مکہ مکرمہ، عربی زبان، تاریخ پیدایش سے بیعت عقبہ ثانیہ تک کے واقعات سیرت میں تاریخی ترتیب موجود ہے لیکن سطر سطر سے جذبات شوق کا وفور بھی نمایاں ہے، واقعات کے ضمن میں ناصحانہ اور اصلاحی انداز بھی غالب ہے، کوہ صفا کے اعلان حق کو 'پہلا تبلیغی جلسہ' سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس اعلان دعوت کی بحث میں موجودہ دور کے علماء، خطبا، شیخ التفسیر، شیخ الحدیث اور ادیب بے مثال جیسے خطابات کے حامل داعیان اسلام پر طنزیہ جملے بھی ہیں، اسی طرح دعوت اسلام کے لئے دعوت طعام کی سنت کو اہم بتاتے ہوئے موجودہ دعوتوں کے چلن پر اچھا خاصا وعظ ہے، اشعار بھی کثرت سے پیش کئے گئے ہیں جو عام قارئین کے لئے سامان لطف ونشاط کا باعث ہیں۔

"نوائے حرم (کلام بیخود) از: جناب حکیم سید احمد حسینی بیخود اورنگ آبادی مرحوم

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۷۶، قیمت ۱۲۰ روپئے، پتہ: اجمیری دواخانہ، شریف کالونی، روشن گیٹ اورنگ آباد، مہاراشٹر۔

اورنگ آباد کے صاحب نسبت بزرگ اور نسبتاً کم معروف لیکن قادر الکلام شاعر کا یہ مجموعہ کلام، پاکیزہ اور بامقصد جذبات کا آئینہ ہے، حمد ونعت کے علاوہ غزلیں بھی ہیں، نظمیں بھی خاصی ہیں اور بعض طویل بھی، جناب بیخود کا تعلق صوفی خانوادے سے تھا، اس لئے مسائل تصوف سے ان کا اعتنا فطری ہے، فلسفہ وحدت الوجود کی مخالفت اور طبقہ صوفیہ میں رائج بعض غیر اسلامی نظریات کا رد ان کی شاعری کا اصل موضوع نظر آتا ہے، ایک طویل نظم 'نزاع دیوبند وبریلی' کے عنوان سے ہے اور یہ خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے، علامہ اقبال ان کے ممدوح ہیں، ان کے طرز وفکر کا تتبع بھی نمایاں ہے، ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ مرحوم کے پیش لفظ نے ان کی شاعرانہ خوبیوں کا اچھا احاطہ کیا ہے، انتساب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام ہے۔

(ع۔ص)